رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۷۲۰

جلد ۵۶ — عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۲۰ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۶	جون سنہ ۱۹۶۱ء	عدد ۳

اشارات :	عبدالحمید صدیقی	۲
تفہیم القرآن :		
. لقمان (۲)	ابوالاعلیٰ مودودی	۵
مقالات :		
جبل پور کے فسادات پر مولانا مودودی اور ایک عرب لیڈر کی مراسلت		۱۶
مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب	جناب نعیم صدیقی صاحب	۲۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ہفتے یہ افسوسناک خبر معلوم ہوئی کہ نئے قانون کے تحت کراچی کے مشہور اسلامی مجلّہ "چراغ راہ" کا ڈیکلریشن منظور کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، نئے قانونِ مطابع کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا کہ حکومت کچھ اخبارات و رسائل کو بند کرنا چاہتی تھی اور اس غرض کے لیے تمام اخبارات و رسائل کے ڈیکلریشن ایک خاص تاریخ کو منسوخ کر دیئے گئے تاکہ سب از سرِ نو ڈیکلریشن کی درخواست دیں اور جن جن کو حکومت بند کرنا چاہتی ہو ان کی درخواست نامنظور کر دی جاتے۔ بلکہ دراصل اس قانون کا منشا یہ تھا کہ اخبارات و رسائل کو چند قانونی حدود کا پابند بنایا جائے اور اس لیے سب کے ڈیکلریشن منسوخ کر کے نئی درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ اب اگر "چراغِ راہ" نے مطلوبہ قانونی حدود، یا ان میں سے کسی کو پورا نہیں کیا ہے تو متعلقہ حکام کا فرض ہے کہ وہ واضح طور پر ان اسباب کی نشان دہی کریں جو اس کا ڈکلریشن منظور کرنے میں قانوناً مانع ہیں۔ لیکن اگر ایسی کسی چیز کی نشان دہی نہیں کی جاتی تو بجا طور پر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ کارروائی کسی ناقابلِ بیان قصور پر انتقاماً کی گئی ہے، جسے مشکل ہی سے قانون کا جائز استعمال قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسا ملک جس کی بنیاد نہ تو جغرافیائی حدود ہوں، اور نہ ہی رنگ و نسل

بلکہ جو محض ایک آئیڈیالوجی کے لیے حاصل کیا گیا ہو اور ایک عقیدہ پر اس کی بقا اور فلاح کا دارومدار ہو، اس میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس ملک کے اساسی تصور کو ہمیشہ اُجاگر کیا جاتا رہے اور اہلِ ملک کی اس کے ساتھ وابستگی ہر لمحہ بڑھتی چلی جاتے۔ کیونکہ یہی تصور اس ملک اور اس کے رہنے والوں کی قوت و طاقت کا اصل سرچشمہ ہے، اسی سے ملک کے ہائل بہ انتشار اجزاء کو جوڑ کر بنیانِ مرصوص بنایا جاسکتا ہے، اسی سے لوگوں کے اندر زندگی کی لگن اور تڑپ پیدا ہوتی ہے، اسی کی محبت میں سرشار ہو کر وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ایک راہ پر لگانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس بنا پر یہ انتہائی ضروری ہے کہ لوگوں کو اس اساسی تصور کے متعلق ہر لمحہ فکری غذا مہیا کی جاتی رہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس ملک میں بہت کم پرچے ایسے ہیں جو اس فرض کو کما حقہٗ سرانجام دے رہے ہوں۔ روشنی کے ان متعدد میناروں میں "چراغِ راہ" ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ اس پرچے کے حوصلہ مند اور ایثار پیشہ کارکنوں نے مخالفتوں کے طوفانوں میں جس بے جگری کے ساتھ اس "لو" کی حفاظت اور پاسبانی کی ہے وہ تاریخِ صحافت میں ایک درخشاں مثال ہے۔ وہ معاشرہ جس میں تاریکیاں اور ظلمتیں اپنے پر برق رفتاری کے ساتھ پھیلا رہی ہوں اس میں "چراغِ راہ" کا بجھ جانا ایک سانحہ نہیں تو اور کیا ہے؟

اسلام کی اس "تجربہ گاہ" میں آرٹ اور ادب کے نام پر جس قسم کی ناپاک کوششیں کی جارہی ہیں وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ معاشرہ جسے اسلامی اقدار کے سانچے میں ڈھالنا مقصود تھا اس کی نوخیز نسلوں میں فحش اور گندے لٹریچر کے اثرات حیرت انگیز تیزی کے ساتھ سرایت کرتے جارہے ہیں۔ اس سے اس ملک میں اخلاقی انارکی کا جو خوفناک طوفان اٹھ رہا ہے وہ ایک بڑی ہی عبرتناک داستان ہے

اور ہر اس فرد کے لیے وجہ اضطراب ہے جو اس ملّت اور ملک کے ساتھ کچھ بھی خیر خواہی کے جذبات رکھتا ہو۔ ان حالات میں یہاں اربابِ اقتدار کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اس اخلاقی انحطاط کو روکنے کے لیے اپنے اختیارات استعمال کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ چڑیوں کے غول سے کعبہ کی حفاظت کرانے کا انتظام تو کر دیتا ہے مگر کسی اخلاق باختہ قوم کو اپنے دین کی خدمت کا کام سپرد نہیں کرتا اور یہی نہیں بلکہ وہ کسی ایسے گروہ کو دنیا میں ایک مدتِ دراز تک جینے بھی نہیں دیتا جو بظاہر تو اسلام کا دم بھرنے والا ہو، مگر اسلام کی سب سے قیمتی متاع یعنی اخلاق سے اپنے آپ کو محروم کرلے ہم حکومت کی خیر خواہی اسی میں سمجھتے ہیں کہ اُسے اس کے فرائض یاد دلائیں اور بار بار اُسے اُن خطرات سے آگاہ کریں جو ملک میں غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سیاسی اختلاف اپنی جگہ سہی مگر اُسے ان اختلافات کی وجہ سے یہ تو نہ کرنا چاہیے کہ اُن لوگوں سے تو درگزر کیا جاتے جو اس ملک کی بنیادوں میں خوفناک سرنگیں بچھا رہے ہوں اور ان لوگوں کی راہ میں مشکلات پیدا کی جائیں جو ان بنیادوں کی حفاظت کر رہے ہوں۔

تفہیم القرآن

لقمان

(۲)

اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمد للہ[۴۴]۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۴۵]۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے[۴۶]، بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ[۴۷]

---

[۴۴] یعنی شکر ہے کہ تم اتنی بات تو جانتے اور مانتے ہو۔ لیکن جب حقیقت یہ ہے تو پھر حمد ساری کی ساری صرف اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے، دوسری کوئی ہستی حمد کی مستحق کیسے ہو سکتی ہے جبکہ تخلیقِ کائنات میں اس کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

[۴۵] یعنی اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو خالقِ کائنات ماننے کے لازمی نتائج اور تقاضے کیا ہیں اور کونسی باتیں اس کی نقیض پڑتی ہیں جب ایک شخص یہ مانتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق صرف اللہ ہے تو لازماً اس کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ الٰہ اور رب بھی صرف اللہ ہی ہے، عبادت اور طاعت و بندگی کا مستحق بھی تنہا وہی ہے، تسبیح و تحمید بھی اس کے سوا کسی دوسرے کی نہیں کی جا سکتی، دعائیں بھی اس کے سوا کسی اور سے نہیں مانگی جا سکتیں، اور اپنی مخلوق کے لیے شارع اور حاکم بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ خالق ایک ہو اور معبود دوسرا، یہ بالکل عقل کے خلاف ہے، سراسر متضاد بات ہے جس کا قائل صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جہالت میں پڑا ہوا ہو۔ اسی طرح ایک ہستی کو خالق ماننا اور پھر دوسری ہستیوں میں سے کسی کو حاجت روا و مشکل کشا ٹھیرانا، کسی کے آگے سرِ نیاز جھکانا، اور کسی کو حاکمِ ذی اختیار اور مطاعِ مطلق تسلیم کرنا، یہ

محمود ہے۴۸۔ زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۴۹۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ تم سارے

سب بھی باہم متناقض باتیں ہیں جنہیں کوئی صاحبِ علم انسان قبول نہیں کر سکتا۔

۴۷ یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے بلکہ درحقیقت وہی اُن سب چیزوں کا مالک بھی ہے جو زمین اور آسمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ نے اپنی یہ کائنات بنا کر یونہی نہیں چھوڑ دی ہے کہ جو چاہے اُس کا، یا اس کے کسی حصے کا مالک بن بیٹھے۔ اپنی خلق کا وہ آپ ہی مالک ہے اور ہر چیز جو اس کائنات میں موجود ہے وہ اُس کی مِلک ہے۔ یہاں اُس کے سوا کسی کی بھی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اُسے خداوندانہ اختیارات حاصل ہوں۔

۴۸ اس کی تشریح حاشیہ نمبر ۹۱ میں گزر چکی ہے۔

۴۹ اللہ کی باتوں سے مراد ہیں اس کے تخلیقی کام اور اس کی قدرت و حکمت کے کرشمے۔ یہ مضمون اس سے ذرا مختلف الفاظ میں سورۂ کہف آیت ۱۰۹ میں بھی بیان ہوا ہے۔ بظاہر ایک شخص یہ گمان کرے گا کہ شاید اس قول میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آدمی تھوڑا سا غور کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ درحقیقت اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔ جتنے قلم اس زمین کے درختوں سے بن سکتے ہیں، اور جتنی روشنائی زمین کے موجودہ سمندر اور ویسے ہی سات مزید سمندر فراہم کر سکتے ہیں، ان سے اللہ کی قدرت و حکمت اور اس کی تخلیق کے سارے کرشمے تو درکنار، شاید موجوداتِ عالم کی مکمل فہرست بھی نہیں لکھی جا سکتی۔ تنہا اس زمین پر جتنی موجودات پائی جاتی ہیں انہی کا شمار مشکل ہے، کجا کہ اِس اتھاہ کائنات کی ساری موجودات ضبطِ تحریر میں لائی جا سکیں۔

انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو اس کے لیے ایسا ہی ہے جیسے ایک متنفس کو پیدا کرنا اور جلا اٹھانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔[۴۹]

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے،[۵۰] سب ایک وقت مقرر تک

اس بیان سے دراصل یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ جو خدا اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لایا ہے اور ازل سے ابد تک اس کا سارا نظم ونسق چلا رہا ہے اس کی خدائی میں ان چھوٹی چھوٹی ہستیوں کی حیثیت ہی کیا ہے جنہیں تم معبود بنائے بیٹھے ہو۔ اس عظیم الشان سلطنت کے چلانے میں دخیل ہونا تو درکنار، اس کے کسی اقل قلیل جز سے پوری واقفیت، اور محض واقفیت تک کسی مخلوق کے بس کی چیز نہیں ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کو یہاں خداوندانہ اختیارات کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی مل سکے جس کی بنا پر وہ دعائیں سننے اور قسمتیں بنانے اور بگاڑنے پر قادر ہو۔

[۴۹] یعنی وہ بیک وقت ساری کائنات کی آوازیں الگ الگ سن رہا ہے اور کوئی آواز اس کی سماعت کو اس طرح مشغول نہیں کرتی کہ اسے سنتے ہوئے وہ دوسری چیزیں نہ سن سکے۔ اسی طرح وہ بیک وقت ساری کائنات کو اس کی ایک ایک چیز اور ایک ایک واقعہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور کسی چیز کے دیکھنے میں اس کی بینائی اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اسے دیکھتے ہوئے وہ دوسری چیزیں نہ دیکھ سکے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ انسانوں کے پیدا کرنے اور دوبارہ وجود میں لانے کا بھی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے آدمی بھی پیدا ہوئے ہیں اور آئندہ قیامت تک ہوں گے، ان سب کو وہ ایک آن کی آن میں پھر پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی قدرتِ تخلیق ایک انسان کو بنانے میں اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اسی وقت وہ دوسرے انسان نہ پیدا کر سکے۔ اس کے لیے ایک انسان کا بنانا اور اربوں انسانوں کا بنا دینا

کے لیے چل رہے ہیں[۵۱]، اور (کیا تم نہیں جانتے) کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر
ہے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے[۵۲] اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں
کو تم پکارتے ہو وہ سب باطل ہیں[۵۳]، اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے[۵۴]۔ ع ۳
کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں
اپنی کچھ نشانیاں دکھائے[۵۵]۔ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اس شخص

یکساں ہے۔

۵۰ یعنی رات اور دن کا پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ آنا خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سورج اور چاند پوری طرح ایک ضابطہ میں کسے ہوئے ہیں۔ سورج اور چاند کا ذکر یہاں محض اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں عالمِ بالا کی وہ نمایاں ترین چیزیں ہیں جن کو انسان قدیم زمانے سے معبود بناتا چلا آرہا ہے اور آج بھی بہت سے انسان انہیں دیوتا مان رہے ہیں۔ ورنہ درحقیقت زمین سمیت کائنات کے تمام تاروں اور سیاروں کو اللہ تعالیٰ نے ایک اٹل ضابطے میں کس رکھا ہے جس سے وہ یک سرِ مو ہٹ نہیں سکتے۔

۵۱ یعنی ہر چیز کی جو مدتِ عمر مقرر کر دی گئی ہے اسی وقت تک وہ چل رہی ہے۔ سورج ہو یا چاند، یا کائنات کا کوئی اور تارا یا سیارہ، ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ ہر ایک کا ایک وقتِ آغاز ہے جس سے پہلے وہ موجود نہ تھی، اور ایک وقتِ اختتام ہے جس کے بعد وہ موجود نہ رہے گی۔ اس ذکر سے مقصود یہ جتانا ہے کہ ایسی حادث اور بے بس چیزیں آخر معبود کیسے ہو سکتی ہیں۔

۵۲ یعنی حقیقی فاعلِ مختار ہے، خلق و تدبیر کے اختیارات کا اصل مالک ہے۔

۵۳ یعنی وہ سب محض تمہارے تخیلات کے آفریدہ خدا ہیں۔ تم نے فرض کر لیا ہے کہ فلاں صاحب خدائی میں کوئی دخل رکھتے ہیں اور فلاں حضرت کو مشکل کشائی و حاجت روائی کے اختیارات حاصل ہیں۔ حالانکہ فی الواقع ان میں سے کوئی صاحب بھی کچھ نہیں بنا سکتے۔

کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔[۵۶] اور جب (سمندر میں) ان لوگوں پر ایک موج پہاڑوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد

۵۴؎ یعنی ہر چیز سے بالا و برتر جس کے سامنے سب پست ہیں، اور ہر چیز سے بزرگ جس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔

۵۵؎ یعنی ایسی نشانیاں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اختیارات بالکل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کیسے ہی مضبوط اور بحری سفر کے لیے موزوں جہاز بنا لے اور جہاز رانی کے فن اور اس سے تعلق رکھنے والی معلومات اور تجربات میں کتنا ہی کمال حاصل کر لے، لیکن سمندر میں جن ہولناک طاقتوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ تنہا اپنی تدابیر کے بل بوتے پر بخیریت سفر نہیں کر سکتا جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اس کی نگاہِ کرم پھرتے ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ذرائع و وسائل اور کمالاتِ فن کتنے پانی میں ہیں۔ اسی طرح آدمی امن و اطمینان کی حالت میں چاہے کیسا ہی سخت دہریہ یا کٹّا مشرک ہو، لیکن سمندر کے طوفان میں جب اس کی کشتی ڈولنے لگتی ہے اُس وقت دہریے کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا ہے، اور مشرک بھی جان لیتا ہے کہ خدا بس ایک ہی ہے۔

۵۶؎ یعنی جن لوگوں میں یہ دو صفات پائی جاتی ہیں وہ جب ان نشانیوں سے حقیقت کو پہچان جاتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے توحید کا سبق حاصل کر کے اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتے ہیں۔ پہلی صفت یہ کہ وہ صَبّار (بڑے صبر کرنے والے) ہوں۔ ان کے مزاج میں تلوّن نہ ہو بلکہ ثابت قدمی ہو۔ گوارا اور ناگوار، سخت اور نرم، اچھے اور بُرے، تمام حالات میں ایک عقیدۂ صالحہ پر قائم رہیں۔ یہ کمزوری ان میں نہ ہو کہ بُرا وقت آیا تو خدا کے سامنے گڑگڑانے لگے اور اچھا وقت آتے ہی سب کچھ بھول گئے۔ یا اس کے برعکس اچھے حالات میں خدا پرستی کرتے رہے اور مصائب کی ایک چوٹ پڑتے ہی خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ دوسری صفت یہ

پڑتا ہے۵۷، اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے۵۸۔

کہ وہ شکور (بڑے شکر کرنے والے) ہوں، نمک حرام اور احسان فراموش نہ ہوں بلکہ نعمت کی قدر پہچانتے ہوں اور نعمت دینے والے کے لیے ایک مستقل جذبۂ شکر و سپاس اپنے دل میں جاگزیں رکھیں۔

۵۷ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ اقتصاد کو اگر راست روی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن میں سے کم ہی ایسے نکلتے ہیں جو وہ وقت گزر جانے کے بعد بھی اس توحید پر ثابت قدم رہتے ہیں جس کا اقرار انہوں نے طوفان میں گھر کر کیا تھا اور یہ سبق ہمیشہ کے لیے ان کو راست رو بنا دیتا ہے۔ اور اگر اقتصاد بمعنی توسط و اعتدال لیا جائے تو اس کا ایک مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض لوگ اپنے شرک و دہریت کے عقیدے میں اُس شدت پر قائم نہیں رہتے جس پر اس تجربے سے پہلے تھے، اور دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ وہ وقت گزر جانے کے بعد ان میں سے بعض لوگوں کے اندر اخلاص کی وہ کیفیت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے جو اُس وقت پیدا ہوئی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ ذو معنی فقرہ بیک وقت اِن تینوں کیفیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال فرمایا ہو۔ مدعا غالباً یہ بتانا ہے کہ بحری طوفان کے وقت تو سب کا دماغ درستی پر آجاتا ہے اور شرک و دہریت کو چھوڑ کر سب کے سب خدائے واحد کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن خیریت سے ساحل پر پہنچ جانے کے بعد ایک قلیل تعداد ہی ایسی نکلتی ہے جس نے اس تجربے سے کوئی پائدار سبق حاصل کیا ہو۔ پھر یہ قلیل تعداد بھی تین قسم کے گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک وہ جو ہمیشہ کے لیے سیدھا ہو گیا۔ دوسرا وہ جس کا کفر کچھ اعتدال پر آگیا۔ تیسرا وہ جس کے اندر اُس ہنگامی اخلاص میں سے کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا۔

۵۸ یہ دو صفات ان دو صفتوں کے مقابلے میں ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں کیا گیا تھا۔ غدار وہ شخص ہے جو سخت بے وفا ہو اور اپنے عہد و پیمان کا کوئی پاس نہ رکھے اور

لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا۔[۵۹] فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے[۶۰]۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں

ناشکرا وہ ہے جس پر خواہ کتنی ہی نعمتوں کی بارش کر دی جائے وہ احسان مان کر نہ دے اور اپنے محسن کے مقابلے میں سرکشی سے پیش آئے۔ یہ صفات جن لوگوں میں پائی جاتی ہیں وہ خطرے کا وقت ٹل جانے کے بعد بے تکلف اپنے کفر، اپنی دہریت اور اپنے شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ انہوں نے طوفان کی حالت میں خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کچھ نشانیاں خارج میں بھی اور خود اپنے نفس میں بھی پائی تھیں اور ان کا خدا کو پکارنا اسی وجدانِ حقیقت کا نتیجہ تھا۔ اُن میں سے جو دہریے ہیں وہ اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ وہ تو ایک کمزوری تھی جو بحالتِ اضطراب ہم سے سرزد ہو گئی، ورنہ درحقیقت خدا وُدا کوئی نہ تھا جس نے ہمیں طوفان سے بچایا ہو، ہم تو فلاں فلاں اسباب و ذرائع سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ رہے مشرکین، تو وہ بالعموم یہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگوں، یا دیوی دیوتاؤں کا سایہ ہمارے سر پر تھا جس کے طفیل ہم بچ گئے، چنانچہ ساحل پر پہنچتے ہی وہ اپنے معبودانِ باطل کے شکریے ادا کرنے شروع کر دیتے ہیں اور انہی کے آستانوں پر چڑھاوے چڑھانے لگتے ہیں۔ یہ خیال تک انہیں نہیں آتا کہ جب ساری امیدوں کے سہارے ٹوٹ گئے تھے اُس وقت اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی نہ تھا جس کا دامن انہوں نے تھاما ہو۔

[۵۹] یعنی دوست، لیڈر، پیر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ تو پھر بھی دُور کا تعلق رکھنے والے ہیں، دنیا میں قریب ترین تعلق اگر کوئی ہے تو وہ اولاد اور والدین کا ہے۔ مگر وہاں حالت یہ ہوگی کہ بیٹا پکڑا گیا ہو تو باپ آگے بڑھ کر یہ نہیں کہے گا کہ اس کے گناہ میں مجھے پکڑ لیا جائے، اور باپ کی شامت آ رہی ہو تو بیٹے میں یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوگی کہ اس کے بدلے مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے۔ اس حالت میں یہ توقع کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی

دھوکے میں نہ ڈالے[۶۰] اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے[۶۱]

دوسرا شخص وہاں کسی کے کچھ کام آئے گا۔ لہٰذا سخت نادان ہے وہ شخص جو دنیا میں دوسروں کی خاطر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے، یا کسی کے بھروسے پر گمراہی اور گناہ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس مقام پر آیت نمبر ۱۵ کا مضمون بھی نگاہ میں رہنا چاہیے جس میں اولاد کو تلقین کی گئی تھی کہ دنیوی زندگی کے معاملات میں والدین کی خدمت کرنا تو بے شک برحق ہے مگر دین و اعتقاد کے معاملہ میں والدین کے کہنے پر گمراہی قبول کر لینا ہرگز صحیح نہیں ہے۔

[۶۰] اللہ کے وعدے سے مراد یہ وعدہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور ایک روز اللہ کی عدالت قائم ہو کر رہے گی جس میں ہر ایک کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔

[۶۱] دنیا کی زندگی سطح بین انسانوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، لہٰذا جتنا کچھ بھی تمہیں کرنا ہے بس یہیں کر لو۔ کوئی اپنی دولت اور طاقت اور خوشحالی کے نشے میں بدمست ہو کر اپنی موت کو بھول جاتا ہے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کا عیش اور اس کا اقتدار لازوال ہے۔ کوئی اخلاقی و روحانی مقاصد کو فراموش کر کے صرف مادی فوائد اور لذتوں کو مقصود بالذات سمجھ لیتا ہے اور "معیارِ زندگی" کی بلندی کے سوا کسی دوسرے مقصد کو کوئی اہمیت نہیں دیتا خواہ نتیجے میں اس کا معیارِ آدمیت کتنا ہی پست ہوتا چلا جائے۔ کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ دنیوی خوشحالی ہی حق و باطل کا اصل معیار ہے، ہر وہ طریقہ حق ہے جس پر چل کر یہ نتیجہ حاصل ہو، اور اس کے برعکس جو کچھ بھی ہے باطل ہے۔ کوئی اسی خوشحالی کو مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت سمجھتا ہے اور یہ قاعدۂ کلیہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے کہ جس کی دنیا خوب بن رہی ہے — خواہ کیسے ہی طریقوں سے بنے — وہ خدا کا محبوب ہے اور جس کی دنیا خراب ہے — چاہے وہ حق پسندی و راست بازی ہی کی بدولت خراب ہو — اس کی عاقبت بھی خراب ہے۔ یہ اور ایسی ہی جتنی غلط فہمیاں بھی ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ

اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے، کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے، اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے[۶۳] ع

نے اس آیت میں "دنیوی زندگی کے دھوکے" سے تعبیر فرمایا ہے۔

[۶۲] الغرور (دھوکے باز) سے مراد شیطان بھی ہو سکتا ہے، کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ بھی ہو سکتا ہے، انسان کا اپنا نفس بھی ہو سکتا ہے، اور کوئی دوسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ کسی شخصِ خاص یا شئے خاص کا تعین کیے بغیر اس وسیع المعنیٰ لفظ کو اس کی مطلق صورت میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے لیے فریب خوردگی کے بنیادی اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ جس شخص نے خاص طور پر جس ذریعہ سے بھی وہ اصل فریب کھایا ہو جس کے اثر سے اس کی زندگی کا رُخ صحیح سمت سے غلط سمت میں مڑ گیا وہی اس کے لیے الغرور ہے۔

"اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے" کے الفاظ بھی بہت وسیع ہیں جن میں بے شمار مختلف قسم کے دھوکے آجاتے ہیں۔ کسی کو اس کا "دھوکے باز" یہ یقین دلاتا ہے کہ خدا سرے سے ہے ہی نہیں۔ کسی کو یہ سمجھاتا ہے کہ خدا اس دنیا کو بنا کر الگ جا بیٹھا ہے اور اب یہ دنیا بندوں کے حوالے ہے۔ کسی کو اس غلط فہمی میں ڈالتا ہے کہ خدا کے کچھ پیارے ایسے ہیں جن کا تقرب حاصل کر لو تو جو کچھ بھی تم چاہو کرتے رہو، بخشش تمہاری یقینی ہے۔ کسی کو اس دھوکے میں مبتلا کرتا ہے کہ خدا تو غفور رحیم ہے، تم گناہ کرتے چلے جاؤ، وہ بخشتا چلا جائیگا۔ کسی کو جبر کا عقیدہ سمجھاتا ہے اور اس غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے کہ تم تو مجبور ہو، بدی کرتے ہو تو خدا تم سے کراتا ہے اور نیکی سے دور بھاگتے ہو تو خدا ہی تمہیں اس کی توفیق نہیں دیتا۔ اس طرح کے نہ معلوم کتنے دھوکے ہیں جو انسان خدا کے بارے میں کھا رہا ہے، اور اگر تجزیہ کر کے دیکھا جاتے تو آخر کار تمام گمراہیوں اور گناہوں اور جرائم کا بنیادی سبب یہی نکلتا ہے کہ

انسان نے خدا کے بارے میں کوئی نہ کوئی دھوکا کھایا ہے تب ہی اس سے کسی اعتقادی ضلالت یا اخلاقی بے راہ روی کا صدور ہوتا ہے۔

۶۳ یہ آیت دراصل اُس سوال کا جواب ہے جو قیامت کا ذکر اور آخرت کا وعدہ سُن کر کفارِ مکہ بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تھے کہ آخر وہ گھڑی کب آئے گی۔ قرآن مجید میں کہیں ان کے اس سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اور کہیں نقل کیے بغیر جواب دے دیا گیا ہے، کیونکہ مخاطبین کے ذہن میں وہ موجود تھا۔ یہ آیت بھی انہی آیات میں سے ہے جن میں سوال کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔

پہلا فقرہ "اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے" یہ اصل سوال کا جواب ہے۔ اس کے بعد کے چاروں فقرے اس کے لیے دلیل کے طور پر ارشاد ہوتے ہیں۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جن معاملات سے انسان کی قریب ترین دلچسپیاں وابستہ ہیں، انسان ان کے متعلق بھی کوئی علم نہیں رکھتا، پھر بھلا یہ جاننا اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ ساری دنیا کے انجام کا وقت کب آئے گا۔ تمہاری خوشحالی و بدحالی کا بڑا انحصار بارش پر ہے۔ مگر اس کا سر رشتہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب، جہاں، جتنی چاہتا ہے برساتا ہے اور جب چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ تم قطعاً نہیں جانتے کہ کہاں، کس وقت کتنی بارش ہوگی اور کونسی زمین اس سے محروم رہ جائے گی یا کس زمین پر بارش اُلٹی نقصان دہ ہو جائے گی۔ تمہاری اپنی بیویوں کے پیٹ میں تمہارے اپنے نطفے سے حمل قرار پاتا ہے جس سے تمہاری نسل کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ مگر تم نہیں جانتے کہ کیا چیز اس پیٹ میں پرورش پا رہی ہے اور کس شکل میں کن بھلائیوں یا برائیوں کو لیے ہوئے وہ برآمد ہوگی۔ تم کو یہ تک پتہ نہیں ہے کہ کل تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آنا ہے۔ ایک اچانک حادثہ تمہاری تقدیر بدل سکتا ہے، مگر ایک منٹ پہلے بھی تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تم کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تمہاری اس زندگی کا خاتمہ آخر کار کہاں کس طرح ہوگا۔ یہ ساری معلومات اللہ نے اپنے ہی پاس رکھی ہیں اور ان میں سے کسی کا علم بھی تم کو نہیں دیا۔ ان

میں سے ایک ایک چیز ایسی ہے جسے تم چاہتے ہو کہ پہلے سے تمہیں اس کا علم ہو جائے تو کچھ اس کے لیے پیش بندی کر سکو۔ لیکن تمہارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ان معاملات میں اللہ ہی کی تدبیر اور اسی کی قضا پر بھروسہ کرو۔ اسی طرح دنیا کے اختتام کی ساعت کے معاملے میں بھی اللہ کے فیصلے پر اعتماد کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس کا علم بھی نہ کسی کو دیا گیا ہے نہ دیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس آیت میں امورِ غیب کی کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہاں تو صرف سامنے کی چند چیزیں مثالاً پیش کی گئی ہیں جن سے انسان کی نہایت گہری اور قریبی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور انسان ان سے بے خبر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ صرف یہی پانچ امورِ غیب ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا حالانکہ غیب نام ہی اس چیز کا ہے جو مخلوقات سے پوشیدہ اور صرف اللہ پر روشن ہو، اور فی الحقیقت اس غیب کی کوئی حد نہیں ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ نمل، آیت نمبر ۶۵ اور اس کا حاشیہ)

جبل پور کے فسادات پر

— مولانا مودودی اور ایک عرب لیڈر کی مراسلت —

[آج سے تین ماہ قبل جبل پور (ہندوستان) میں جو خون آشام فسادات رونما ہوئے تھے اُن کے متعلق دنیائے عرب کی افسوسناک خاموشی کو دیکھ کر مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودودی نے ایک طویل خط غساوات کی مختصر روداد کے ہمراہ حجاز کے ادارہ امر بالمعروف کے سکرٹری محمد احمد باشمیل کو لکھا تھا اور اس کی نقول ازہر یونیورسٹی، مصر کے ریکٹر شیخ محمد محمود شلتوت، مراکش کے سابق وزیرِ انصاف شیخ عبداللہ کنون، اور اسلامک سنٹر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کے ڈائرکٹر سعید رمضان کے نام بھیجی تھیں۔ اور ان حضرات کے اسلامی جذبات سے اپیل کرتے ہوئے ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی کا مطالبہ کیا تھا۔ مولانا محترم کے اس خط کے جواب میں حجاز کے محمد احمد باشمیل صاحب کا ایک طویل خط موصول ہوا ہے جسے ہم افادۂ عام کی غرض سے ترجمان القرآن کے اوراق کی زینت کر رہے ہیں۔

محمد احمد باشمیل صاحب عرب کے غیور اور دردمند اہلِ قلم ہیں اور آج کل ادارہ امر بالمعروف کے حجاز ڈویژن کے سیکرٹری ہیں۔ موصوف کے رشحاتِ قلم سے حال ہی میں دو زبردست کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں سے ایک "القومیۃ فی نظر الاسلام" (اسلامی نقطۂ نظر سے قومیت کی حقیقت) اور دوسری: "صراع مع الباطل" (باطل نظریات سے کشمکش) ہے۔ ان

دونوں کتابوں میں موجودہ عرب نیشنلزم کا تاریخی اور اسلامی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے اور اُس کی بنیادی خرابیوں کو اور بُرے نتائج کو بلاکم وکاست واشگاف کیا گیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ عرب نیشنلزم کا ابطال کرنے والا وہ شخص ہے جو نہ صرف عرب ہے بلکہ عرب عاربہ میں سے ہے اور وادی اَحقاف (حضر موت) کے اُس عرب قبیلے کا فرد فرید ہے جس کا سلسلۂ نسب کھلان بن سبا قحطانی سے جا کر ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ عرب نیشنلزم کے علمبرداروں کی نسبت، جن میں اصیل عربوں کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں سے متجاوز نہیں ہے، عرب نیشنلزم کے نعرہ کا مخالف ایک ٹھیٹھ اور آبِ تمقاق سے زیادہ خالص عرب ہے۔ موصوف کی یہ دونوں کتابیں عرب قومیت کے گڑھ بیروت (لبنان) میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا اور تین ہی ماہ بعد ستمبر ۱۹۶۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن معتدبہ اضافوں کے ساتھ چھاپنا پڑا اور اب مصنف موصوف کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہِ رواں کے بعد تیسرا ایڈیشن بھی آرہا ہے اور اس میں ان شاء اللہ جبل پور کے خونیں فسادات کی داستان بھی اپنے لیے قابلِ قدر جگہ حاصل کر سکے گی۔

محمد احمد باشمیل اس لحاظ سے دنیا کے ہر مسلمان اور خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ موصوف وہ یگانہ شخصیت ہیں جس نے عرب قومیت کے جنون خیز نعروں اور بلاخیز طوفانوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر عرب قومیت پر بھرپور وار کیا ہے۔ حالانکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس حمام میں بڑے بڑے بھی ننگے ہو گئے تھے۔ اور اگر کسی کو اختلاف بھی تھا تو وہ زیرِ لب دب کر رہ گیا تھا لیکن اس مردِ مجاہد نے طوفانی لہروں کے علی الرغم نیشنلزم کو

اسلام کے حق میں اور خود عربوں کے حق میں زہر ہلاہل ثابت کیا اور اُن لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ثابت کیا جو غیر عرب مسلمانوں کو غیر عرب ہونے کی وجہ سے تحقیر آمیز سلوک کا نشانہ بناتے تھے اور ایک بت پرست برہمن زادے کو "عرب دوستی" کے صلہ میں "رسول السلام" کا لقب دیتے تھے۔ موصوف کی ان کتابوں نے سعودی عرب کی فضا کو خاص طور پر مائل بہ اصلاح کر دیا ہے پچھلے دنوں جب ہمیں سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہاں باشمیل صاحب کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی تھیں اور سرکاری افراد تک کھلم کھلا عرب نیشلزم سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ دراصل ضرورت صرف جرأت اور بے باکی کی ہوتی ہے۔ ایک شخص جب اپنی ایمانی قوت کے ساتھ حق بات کا اعلان کرتا ہے تو کائنات کی پوری فضا اُس کی حمایت میں ہوتی ہے اور اس کی آواز میں تاثیر کی روح پھونکتی ہے۔

باشمیل صاحب کی خالص اسلامی ذہنیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کی نگاہ میں فلسطین، سویز اور ٹریمی وغیرہ مسائل کی جو اہمیت ہے مسئلہ کشمیر کی اہمیت ان سے کسی نوع کم نہیں ہے۔ چنانچہ موصوف نے اپنی کتاب میں اس مسئلے کو خاص طور پر لیا ہے اور اس کی اہمیت و نزاکت کے باب میں اُن تمام دلائل کو اپنی کتاب میں من وعن شامل کیا ہے جو انہیں مولانا مودودی کے ۵۹ء کے سفر عرب کے دوران مولانا محترم کی مختلف گفتگوؤں سے حاصل ہوئے تھے۔ اگر اللہ کی توفیق شامل حال رہی تو ہم ترجمان کے صفحات میں اس کتاب کا تفصیلی تعارف کرائیں گے۔ اس وقت موصوف کو جبل پور کے واقعات کی پوری روداد

مع تصاویر بر فوراً فراہم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اُن کی اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہندی مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے۔ باشمیل صاحب کا پتہ یہ ہے:

سکرٹری ہیئتہ امر بالمعروف۔ مکہ" خ۔ح]

مولانا مودودی کا خط

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ہندوستان کے ایک شہر جبل پور میں ۱۱ ار اور ۴ ار فروری ۱۹۶۱ء کے درمیانی عرصہ میں وہاں کے بے بس مسلمانوں پر جو حادثہ گزرا ہے امید ہے اُس کی خبریں آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہوں گی۔ ہمارے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ہمارے عرب بھائیوں کو ان واقعات کی خبر نہ ہوئی ہو گی۔ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں عرب سفارت خانے قائم ہیں اسی طرح دہلی، بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں عرب اخبارات کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ ان واقعات کی مفصل روداد یں پاکستان کے اخبارات میں بھی شائع ہوئی ہیں بلکہ پاکستان کے مسلم عوام نے ہر جگہ ان واقعات پر احتجاج کیا ہے اور یہاں بھی تمام عرب ممالک کے سفارت خانے موجود ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ابھی تک نہ کسی عرب حکومت نے ان واقعات کے خلاف کوئی احتجاج کیا ہے اور نہ کسی عرب اخبار ہی نے ان پر افسوس و مذمت کا کوئی حرف لکھا ہے۔ بلکہ ان واقعات کی خبریں تک عربی اخبارات میں نہیں آئی ہیں، کجا کہ حکومتِ ہند سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا اور ان مظالم کے انسداد کا مطالبہ کیا جاتا جو تقسیم ملک کے بعد سے مسلسل وہاں کے مسلمانوں پر توڑے جا رہے ہیں۔ عرب بھائیوں کی طرف سے یہ بڑی افسوسناک روش سامنے آ رہی ہے جو ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کے مسلمانوں میں اپنے ناگوار اثرات چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ہمارے عرب بھائی غیر عرب مسلمانوں سے تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ فلسطین، الجزائر، بُریمی اور دوسرے مسائل میں ان کی ہر طرح کی تائید کریں لیکن دوسرے مسلمانوں پر اگر قیامت بھی ٹوٹ پڑے تو وہ خود ہمدردی کا ایک کلمہ اور احتجاج و مذمّت کا ایک لفظ تک زبان سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے کہ عرب بھائی ہندوستان میں رُونما ہونے والے فسادات کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ اگر ان کے متعلق انہوں نے حکومتِ ہند کی مُسلم کُش کارروائیوں کے خلاف کوئی احتجاج کیا تو ان کی یہ دوست حکومت ناراض ہو جائے گی۔ کیا اسی اساس پر پاکستانی مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بھی جواب میں ایسا ہی نقطۂ نظر اختیار کریں اور یہ سوچنے لگیں کہ اگر الجزائر کے مسئلہ میں انہوں نے اپنے عرب بھائیوں کی تائید کی تو فرانس بگڑ جائے گا، قضیۂ فلسطین میں ان کا ساتھ دیا تو اسرائیل بلکہ دنیا بھر کے یہودیوں کی ناراضی مول لینی پڑے گی جن کا اثر ونفوذ ساری دنیا میں اور خاص طور پر امریکہ میں جتنا کچھ پایا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، بُریمی کے معاملہ میں ان کی حمایت کی تو انگریز کو ناگوار گزرے گا۔ لیکن ہم ان تمام باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ ہمارے سامنے وہ دینی رشتہ ہے جو ہمیں عربوں کے ساتھ مربوط کیے ہوئے ہے اور جو ہر دوسرے رشتہ سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم بہر حال اپنے ملکی اور قومی مفادات کو اہمیت دیئے بغیر عربوں کے ہر قضیہ میں اُن کی حمایت کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ لیکن ہمیں تعجب ہے کہ عرب آخر ان تمام بے تحاشا مظالم پر کیوں چُپ سادھے ہوتے ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے حکومتِ ہند وہاں کی مسلم اقلیت پر مسلسل توڑ رہی ہے۔ یہ صورتِ حال کئی سالوں سے مشاہدے میں آرہی ہے۔ وہ مصر جس کو اب تک ہم سے شکایت ہے کہ پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم، سہروردی صاحب نے ـــ نہ کہ پاکستان کے عوام نے ـــ قضیۂ سویز میں اُس کی حمایت نہیں کی، آج جبل پور کے مسلمانوں پر ہندوؤں کے ہاتھوں بے پناہ

مظالم ڈھائے جانے پر بھی کیوں شرمناک خاموشی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

میں ان گزارشات کے ساتھ جبل پور کے مظالم کی مختصر روداد بھیج رہا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ وہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں کن شرمناک وحشیانہ درازدستیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ تمام تفصیلات میں آپ کو خاص طور پر اس لیے بھیج رہا ہوں کہ سعودی عرب اور دوسرے کسی عرب ملک میں آپ کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا جو اس معاملہ کی اہمیت کو سمجھے اور اس کے متعلق کوئی عملی اقدام کرے اور اس طرح عدل و انصاف اور اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ دینی رشتہ کے تقاضوں کو پورا کرے۔ اگر میں اس کے متعلق براہ راست کسی عرب ملک کے اخبار کو کچھ لکھوں تو مجھے یہ بھی توقع نہیں کہ وہ اس آواز پر کان دھرے گا اور اسے اپنے صفحات میں جگہ دیگا۔

اس کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ بلادِ عرب اور بلاد ہندو پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان اگر موجودہ روش برقرار رہی تو دیر یا سویر اس کا ادھر کے مسلمانوں میں بھی لازماً بُرا ردِ عمل رونما ہوگا اور اخوتِ اسلامی کے رہے سہے جذبات بھی ماند پڑتے چلے جائیں گے۔ کیا وہ وقت بہت پسندیدہ ہوگا جب ہر مسلمان ملک بس اپنے ہی مفاد کو دیکھتا رہے اور ایک پر کوئی آفت آئے تو دوسرے ٹس سے مس نہ ہوں؟

محمد احمد باشمیل کا جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ کا مفصل گرامی نامہ موصول ہوا۔ جبل پور (ہندوستان) کے جگر دوز واقعات معلوم کر کے سخت رنج ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری عرب دنیا اس خونریز حادثہ سے سرے سے بے خبر ہے کیونکہ عرب اخبارات نے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف

تک شائع نہیں کیا۔ عرب صحافت کے اس متفقہ مقاطعہ پر ایک مسلمان کا دل خون کے آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ — جیسا آپ نے خود خط میں بیان کیا ہے — ہو نہیں سکتا کہ اس واقعہ کی خبریں ہندوستان میں عرب اخبارات کے ذرائع تک نہ پہنچی ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس حادثۂ جانکاہ کی اشاعت سے دانستہ گریز کیا گیا ہے اور اس معاملے میں عربوں نے اپنے برہمن جگری دوست "رسول السلام" سے پیمانِ محبت کو اور اس کی خوشنودی کو مقدم رکھا ہے۔ ہندوستان میں جن دنوں یہ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی عرب صحافت اپنے خیال کے مطابق اس سے اہم اور برتر واقعہ — خلفشارِ کیوبا — میں مشغول تھی۔ تمام اخبارات نے عرب عوام کی توجہات اس واقعہ پر مرکوز کی ہوئی تھیں۔ اخبارات کی بھاری بھرکم سرخیاں کیوبا کے دفاع، کمیونسٹ کاسترو کی قصیدہ خوانی اور امریکہ پر شدید حملوں سے لبریز ہوتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب صحافت کی رکاکت اور ژاژخائی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ یہ مسائلِ دیگراں — کیوبا اور کانگو وغیرہ — میں عین اس وقت بھی ہمہ تن غرق تھی جبکہ اسرائیل عربوں کے منہ پر سخت ذلت آمیز تھپڑ رسید کر رہا تھا اور بیت المقدس میں اپنی عظیم الشان فوجی نمائش کر رہا تھا جس میں مختلف نوعیت کے بھاری اور ہلکے اسلحہ دکھا کر یو۔این۔او کی قرارداد کی دھجیاں بھی اڑا رہا تھا اور عربوں کے منہ پر بھی تھوک رہا تھا۔ مزید افسوسناک بات یہ ہے کہ عین اس گھڑی جب بیت المقدس میں یہودی طاقتیں عسکری نمائش میں لگی ہوئی تھیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کے گلے کٹ رہے تھے ایک بہت بڑے عرب ملک کی نیشنل اسمبلی ہنگامی اجلاس منعقد کر رہی تھی اور متفقہ طور پر کیوبا پر حملہ آوروں کے حق میں قراردادِ مذمت پاس کر رہی تھی، کاسترو کی حمایت کا اعلان کر رہی تھی، روسی گاگرین کی فضائی مہم میں کامیابی پر مسرت کا اظہار کر رہی تھی اور نکیتا خروشچف کو اس کامیابی پر مبارکبادی کا پیغام دے رہی تھی۔ خدا کی قسم اس صورتِ حال پر مسلمان

اور اسلام اشکبار نہ ہوں تو کیا ہو۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مجھے شخصی طور پر واقعہ جبل پور کے بارے میں سرسری سی معلومات پاکستانی سفیر متعینہ سعودی عرب سے حاصل ہوئی تھیں۔ لیکن اس حادثۂ عظیم پر عرب صحافت کا کلیتہً منقار زیر پر رہنا میرے سبب موجب حیرت نہ تھا۔ اس لیے کہ جو قوم اسلام کا نام سنتے ہی دگرگوں ہونے لگتی ہو اس قوم سے اس روش کے علاوہ اور کسی بات کی توقع عبث ہے۔ عرب صحافیوں کا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ خود دنیائے عرب کے مرکز میں مسلمانوں کے مسائل کے خلاف آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں۔ بیچارے ہندی مسلمانوں کے حق میں اُن سے کس چیز کی امید کی جا سکتی ہے۔ ہم اپنی حد تک پوری کوشش کریں گے کہ اپنے ملک کے عوام کو اس انسانی قتل کی تفصیلات سے آگاہ کر دیں۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو یہ توفیقِ الٰہی کا فیض ہو گا اور اگر ناکام ہوئے تو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا کارساز اللہ ہی ہے۔ اور اس کی ذات برتر و بزرگ کے بغیر کوئی تدبیر کارگر نہیں۔ ہم نے مکہ کے روزنامہ الندوہ سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ الندوہ نے ہم سے پورے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ جریدہ عکاظ کے ساتھ بھی گفتگو کریں گے۔ یہ اخبار بھی سعودی عرب سے شائع ہوتا ہے۔ اسلامی مزاج رکھتا ہے۔ ، کے رئیس التحریر بڑے نڈر اور جری ہیں۔ امید ہے کہ یہ بھی تعاون علی الخیر سے گریز نہیں کرے گا۔ جبل پور کے مکمل حالات کی ایک کاپی القدس میں استاذ کامل الشریف کو بھی بھیجنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ اپنے یومیہ اخبار المنار میں اُسے من و عن شائع کریں۔ المنار کے کارپرداز القدس کی مؤتمر اسلامی کے کارکن ہیں۔

البتہ ہم آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اس داستانِ بہیمیت کی مزید تفصیلات مہیا کریں اور اخبارات کی اصل رپورٹیں شمارہ وتاریخ کے تعین کے ساتھ بھیجیں۔ نیز اگر ہو سکے تو اس واقعہ کے مختلف مناظر کی زیادہ سے زیادہ تصویریں بھی روانہ

فرمائیں۔ میں آنے والے سال ہجری کے آغاز میں اپنی کتاب "القومیۃ فی نظر الاسلام" کی طبع سوم کا ارادہ رکھتا ہوں اور "الدوامغ" کے نام سے ایک نئی کتاب بھی بتوفیق الٰہی شائع کرنے کی نیت رکھتا ہوں۔ آپ جبل پور کے متعلق جو ممکن تفاصیل اور تصاویر فراہم کریں گے، میں انشاء اللہ ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کے اندر پورے اہتمام سے شائع کر دوں گا۔ ایک کم مایہ انسان کی بھی کچھ دوڑ دھوپ ہو سکتی ہے اور ایک درماندہ شخص بھی کچھ ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عرض پرداز ہوں کہ وہ اپنے دین کو ایسے شخص کے سپرد کرے جو اس کا بول بالا کرے اور اس کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے۔ وہی سمیع و مجیب ہے۔

معاف کیجیے اس خونیں داستان کا ذکر چھڑ جانے کی وجہ سے میں آپکی صحت کے بارے میں بھی دریافت نہیں کر سکا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کی صحت آج کل خراب ہے۔ آپ کی صحت ہمارے لیے بڑا قیمتی سرمایہ ہے، امید ہے آپ فوری اطلاع کے ذریعے ہمارے لیے سامانِ تسلی مہیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر شفائے عاجل کا فیضان کرے اور دورِ حاضر کی اسلام دشمن طوفان خیزیوں کے اندر آپ کو سپرِ اسلام بنا کر محفوظ و مصئون رکھے۔ وہی سمیع و مجیب ہے۔

میں مکرر درخواست کرونگا کہ آپ جبل پور کے فسادات کی کامل معلومات اور تصاویر مجھے ارسال فرمائیں تاکہ میں اپنی کتاب میں انہیں شامل کر سکوں، اور ان منافقین کی قلعی کھولی جاسکے جن کی زبانیں اسلام کا نام لیتے نہیں تھکتیں لیکن درپردہ وہ ایسے خونریز فسادات کی سرپرستی کر رہے ہیں جن کے ارتکاب سے جنگل کے درندے بھی اپنے کو بالا سمجھتے ہیں۔ نیز ہم دنیا پر یہ بھی واضح کریں گے کہ ان فسادات کے بارے میں عرب پریس نے گاؤپرستوں کی خاطر سے واضح حقائق کے بارے میں کس قدر مجرمانہ مداہنت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ وہی پریس ہے جو ایک عیسائی لیڈر لومبا کے قتل پر پوری دنیا کے اندر ہنگامہ کھڑا کرتا ہے، لیکن اسی پریس کے سامنے جب اجتماعی طور پر وحشیانہ قتل و غارت کی داستان آتی ہے جس میں اہلِ اسلام کی تکا بوٹی ہو جاتی ہے اور انکی مساجد کی بیحرمتی اور انکے گھروں کی بربادی میں کوئی کسر نہیں رکھی جاتی، تو یہ ایک تنکا ہلانے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔

مطلق العنان اقتدار کے تحت مجدد و مذہبی مناصب

اوّلین تجربہ ــــ خلافت عباسیہ میں

از جناب نعیم صدیقی صاحب

[اس مضمون کے پہلے حصے میں خلافت عباسیہ کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جسے سامنے رکھ کر ہی اس اصل بحث کو سمجھا جا سکتا ہے جو دوسرے حصے میں آ رہی ہے۔ یہ اصلی بحث آئندہ شمارے میں دی جا رہی ہے]

کتنا بڑا سانحہ تھا کہ عین وہی ملت یا جماعت جو دنیا سے مطلق العنان اقتدار اور شخصی و موروثی حکومت کا سلسلہ ختم کرنے اٹھی تھی، چند ہی قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گری تو ایسی گری کہ مطلق العنان اقتدار اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا اور اس نے جبر و استبداد کے کوڑے کے بل پر اسے صدیوں تک منزل مقصود سے الٹی سمت میں دوڑایا۔

مطلق العنان اقتدار کی فطرت کسی حکمراں فرد کی نرمی کے باوجود انسانیت کے لیے کبھی مشفقانہ نہیں ہوتی بلکہ قہر و غضب اس کا مزاج ہے، جور و ستم اس کا وصف ہے، تلوار اس کی دلیل ہوتی ہے اور تخویف و تہدید کی آب و ہوا میں وہ پھلتا پھولتا ہے۔ یہی صورت ہمیں اپنی تاریخ میں پیش آئی۔ خوں ریزیاں، سازشیں، اصلاحی و تعمیری رجحانات کو کچلنے کی کوششیں، مساوات و جمہوریت کی غارت گری، ضمیروں سے زندگی چھیننے کی تدبیریں، یہ ساری چیزیں مطلق العنان اقتدار کے لوازم میں داخل ہیں۔ حضرت امیر معاویہ کی نیت کچھ بھی رہی ہو اور ان کے رجحانات اور فیصلوں کے حق میں کیسے بھی دلائل ہمارے پاس ہوں لیکن ان کے ہاتھوں سے تاریخ کے دھارے کا رُخ

ذرا سا جو بدلا تو پھر یہ گھماؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ موروثی شخصی سلطنت کو خلافت کا نام دینے کے باوجود یہ ناگزیر تھا کہ اس درخت سے یزید، ابن ہبیرہ، حجاج، مروان اور ہشام جیسی شاخیں پھوٹیں اور کربلا، حرہ اور قتلِ سادات جیسے برگ و بار آئیں۔ پھر یہ بھی ناگزیر تھا کہ اس درخت کی چھاؤں میں امراپرستانہ عجمی ثقافت کی مجلسیں آراستہ ہوں جن میں شرابِ عشرت کے دور چلیں اور مغنیانِ آتش نوا متاعِ ہوش کے رہزن بنیں ــــ درآنحالیکہ اردگرد ممتاز داعیانِ حق ذبح ہو رہے ہوں اور مسلم عوام کے لاشے تڑپ رہے ہوں۔

ملت نے اس تبدیلی کو دیر تک قبول نہیں کیا اور اس کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی انقلابی تحریکیں اٹھائیں۔ سب سے پہلے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اٹھے (۶۰ھ)، پھر عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے بھائی مصعب (۶۵ھ تا ۷۳ھ) نمودار ہوئے، پھر زید بن علی (۱۲۱ھ) اور یحییٰ بن زید (۱۲۵ھ) آگے بڑھے اور یہ انقلابی لہریں پے در پے اٹھتی رہیں۔ بلکہ زیدی تحریک کو بھی ایک حد تک، اور اس کے بعد نفس زکیہ کی تحریک کو خاص طور پر ایک طرف مدینہ میں حضرت امام مالکؒ کی اور کوفہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ زید کے متعلق حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد تھا کہ "ان کا نکلنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کی طرف اقدام کرنے کے مشابہ ہے"[۱] ان کو دس ہزار روپیہ کی مالی امداد بھی روانہ کی[۲]۔ حضرت امام ابوحنیفہ بہ حیثیت ایک انقلابی شخصیت کے نہ صرف عملاً بڑی جسارت سے مختلف ادوار میں مختلف اسالیب سے کام کرتے رہے اور مطلق العنان اور جبر کیش اقتدار کی ناک کے عین نیچے بیٹھ کر انہوں نے نت نئی راہیں نکالیں بلکہ ان کی بصیرت بھی اس معاملے میں کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ انہوں نے

---

[۱] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۱۰۳

[۲] " " " ص ۱۱۴ بہ حوالہ مناقب موفق ج ۱ ص ۲۶۰

انقلاب کا بہترین موقع اس دورِ تحول کو سمجھا جبکہ اموی اقتدار متزلزل ہو رہا تھا اور صرف ایک دھچکے کا محتاج تھا اور دوسری طرف مختلف قوتیں ـــ شیعہ، خوارج، ابو مسلم خراسانی کی قیادت میں اہلِ فارس ـــ میدان مارنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ تاریخ التشریع الاسلامی میں خضری نے امام کی بصیرت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ بنو امیہ سے بنو عباس کی طرف انتقالِ اقتدار کا موقع جب حضرت ابو حنیفہ کے سامنے آیا تو اس دورِ تحول میں کوفہ ایک عظیم انقلابی تحریک کا مرکز بن گیا[1][2]۔ اس موقع پر نفس زکیہ کی تحریک (خروج سنہ ۱۴۵ھ) زیرِ زمین تیار ہو رہی تھی۔ یہ تحریک جس کی زمام بعد میں ابراہیم بن عبداللہ (نفس زکیہ کے بھائی) نے سنبھالی، اس کے حق میں امام صاحبؒ نے زور شور سے (جہاراً) کام کیا اور لوگوں کو فتویٰ دیتے تھے کہ اس میں شرکت ۵۰ حج سے زیادہ افضل اور سرحد پار کفار کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ باعثِ ثواب ہے[3]۔ ادھر اسی تحریک کی حمایت میں حضرت امام مالکؒ نے منصور کی حکومت کے جواز کو چیلنج کرتے ہوئے جبری بیعت کو کالعدم قرار دیا اور مسئلہ بیعت پر گفتگو کرنے میں مزاحمت دیکھی تو جبری طلاق کے عدمِ وقوع کے اعلان کو ذریعہ کار بنایا[4]۔ یہ تحریک عباسی حکومت کے ظہور کے بعد سطح پر آئی۔ اور الیافعی کے بیان کے مطابق اس کی وجہ سے منصور جیسے جابر حکمران کے لیے ۵۰ دن تک خواب و خور حرام ہو گیا تھا[5]۔ اگرچہ موجِ خونِ انقلاب پسندوں کے سر سے گذر گئی مگر ان کے کارناموں نے اس دور کی تاریخ کو ہمارے لیے باعثِ ننگ نہیں بننے دیا۔

---

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام ـ از محمود بن محمد ابن عرنوس ص ۲۷ [2] ایضاً ص [illegible]

[3] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ـ از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۲۴۹ تا ۲۵۱

[4] تاریخ ابن اثیر کامل ج ۵، ص ۱۹۷

[5] ائمہ اربعہ ـ از رئیس احمد جعفری ندوی ـ ص ۶۰

اموی دور میں عربوں کے تفوق اور ان کے خلافِ مساوات رویّے نے ایرانیوں میں جو بیزاری پیدا کر دی تھی اس سے کام لے کر ابو مسلم خراسانی نے خراسان میں اپنی ایک تحریک چلا رکھی تھی اور بنو امیہ کے خلاف مختلف عناصر کے رجحانات سے وہ اپنے سرمایہ کا میں اضافہ کرتا رہا۔ اہلِ بیت کی روحانی امامت جب عباسیوں میں منتقل ہو گئی تو بنی امیہ کے خلاف کام کرنے کے لیے ان کا تعاون ابو مسلم خراسانی سے ہو گیا۔ عباسی اپنی جگہ ابو مسلم خراسانی کو اور ابو مسلم خراسانی عباسیوں کو استعمال کرنے کے درپے تھے۔ آخر بنو امیہ کا تخت اُلٹ گیا اور عباسی سلطنت قائم ہوئی۔

حالات جب غلط رُخ پر پڑ جاتے ہیں تو لوگ بار بار تبدیلی کی تمنائیں کرتے ہیں لیکن ہر بار جو تبدیلی آتی ہے وہ بد سے بدتر مراحل میں لے جاتی ہے۔ یہی یہاں بھی ہوا۔ وہ تمام خرابیاں جو بنو امیہ کے دور سے اٹھیں ان کی تکمیل بنو عباس کے دور میں ہوئی۔ واضح رہے کہ افراد اور اشخاص میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں اور ہر کسی کے اچھے کارنامے بھی موجود ہیں۔ ان کا انکار نہیں —— مگر تاریخ کا طالب علم افراد کا سوانح نگار نہیں ہے۔ اسے تو یہ دیکھنا ہے کہ اجتماعی زندگی کا تاریخی دریا کس رُخ پر بہہ رہا تھا اور کدھر کو بہایا جا رہا تھا۔

بنو عباس کے دور کے نہایت ہی اہم پہلو یہ تھے:

مطلق العنانی اور استبداد مطلق العنان اقتدار عجم کے معروف نظریہ —— بادشاہت کے خدائی حقوق —— پر استوار ہوا۔ منصور کا اپنا قول تھا کہ "میں دنیا میں خدا کی طرف سے حکمران ہوں"[1]۔ حضرت جابرؓ (صحابی رسولﷺ) کو ایک نازک موقع پر ان کے شاگرد قبیصہ نے کہا تھا: "ان ھؤلاء القوم صاروا ملوکا"[2]۔ بقول سید امیر علی: "خلیفہ تمام اختیارات کا منبع تھا"[3]۔

---

[1] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) — از پروفیسر علی ابراہیم حسن ص ۱۰۷

[2] طبقات ابن سعد

[3] A SHORT HISTORY OF SARACENS — By AMEER ALY SYED — P: 405

جبر و استبداد کے لحاظ سے عباسیوں نے امویوں کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ یہ حکومت تنقید کی متحمل نہیں تھی جیسے کہ مامون نے قاضی ابن ابی دؤاد سے کہا تھا کہ عنر ورت کسی کی نکتہ چینی کی پرواہ نہیں کر سکتی (المامون۔ ۱۵۲)۔ ابو مسلم خراسانی سے ایک شخص نے پوچھا کہ کالا لباس کس بنا پر اختیار کیا گیا ہے۔ اس نے جواب دینے کے بعد اسکی گردن اڑا دی کہ اس نے سوال کیوں کیا؟[1] ۶ لاکھ افراد کا خون اس شخص کی گردن پر ہے۔ سفاح نے دورِ عباسی کا آغاز اس شان سے کیا کہ امویوں کا خون بے دردی سے بہایا، ان کی قبریں اکھیڑ دیں اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی۔[2] ایک عباسی سپہ سالار نے ۸۰ سربرآوردہ امویوں کو دعوت میں بلایا اور مہمانوں کے سامنے ان کی گردنیں مار کر ان کے تڑپتے لاشوں کے اوپر ہی دستر خوان بچھا کر ضیافت کا لطف اٹھایا[3]۔ ایک عباسی سردار کہتا ہے: اگر امیر المومنین ہمیں نماز میں قبلہ کی طرف پیٹھ کرنے کا بھی حکم دیں، تو بھی ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے[4]۔ پھر منصور نے نفس زکیہ اور ابراہیم کی تحریک کو کچلنے کے بعد سادات کا بیج مار دینے کی مہم چلائی۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسی ہستیوں کی کھال کوڑوں سے ادھیڑ ڈالی۔ عباسیوں کے دربار کا ایک مستقل جزو نطع ہوتا تھا یعنی وہ چمڑا جس پر بٹھا کر جلاد اجل رسیدگاں کے سر قلم کرتے تھے[5]۔

ایسا مطلق العنان، جابرانہ اور شخصی اقتدار جو رائے عام سے بے نیاز اور معینہ دستوری حدود سے بالاتر ہو، ضمیروں پر چونکہ خوف کی منحوس پرچھائیں ڈالے رکھنے پر مجبور تھا، اس لیے

---

[1] تاریخ بغداد۔ از خطیب بغدادی ج ۱۰، ص ۲۰۸

[2] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین ندوی۔ حصہ ۳، ص ۸

[3] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ)۔ از پروفیسر فلپ کے ہتی۔ ص ۱۰۲۔

[4] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۲۱۵ بحوالہ "رسالۃ الصحابہ" از ابن المقفع۔

[5] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر کے فلپ ہتی ص ۱۰۲۔

خفیہ پولیس اور جاسوسی کا انتہائی کڑا انتظام قائم تھا۔ اس کام کے لیے "صاحب البرید" ڈائرکٹر محکمۂ ڈاک، کے علاوہ خفیہ پرچہ نویس بھاری تعداد میں مقرر تھے۔ گھوم پھر کر رجحانات کا جائزہ لینے کے لیے ہر طبقے کے افراد بڑی بھاری تعداد میں مامور تھے[1] حتیٰ کہ دارالحکومت میں ۱۷۰۰ عجوزہ عورتیں (کٹنیاں)، گردش کرتی تھیں[2]۔ یہ جاسوسی نظام فی نفسہ نہایت فاسد بھی تھا، چنانچہ اس پر امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں گرفت کرتے ہوئے خلیفہ سے یوں خطاب کیا ہے کہ:

"حکام اور رعایا کے جن حالات سے ان کو واقف اور باخبر ہونا چاہیے ان سے بے توجہی کرتے ہیں، رعایا کے معاملات میں حکام کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور ان کی زیادتیاں اور صحیح خبریں چھپاتے ہیں، جو والی اور عمال ان کو راضی نہیں رکھتے ان کے متعلق غلط خبریں دیتے ہیں۔۔۔ ان کی جگہ عادل اور ثقہ لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے، کسی غیر عادل خبر رساں کی اطلاع کو قبول نہ کرنا چاہیے، جو لوگ خبروں کو چھپائیں یا ان میں اضافہ کریں ان کو سزا دی جائے[3]۔"

ان سنگین حالات کے پنجرے میں قرنہا قرن بے بسی سے جکڑے رہنے کی وجہ سے ہی مسلمانوں کے ذہن نے بادشاہت کے ساتھ ایسی سازگاری کر لی کہ ایک طرف ان کا پورا فلسفۂ سیاسیات (معمولی استثناء کے ساتھ) بادشاہت کے محور کے گرد گھوم گیا اور دوسری طرف ان میں جابرانہ اقتدار کے تحت اطمینان سے پڑے رہ کر ظلم سہنے اور اطاعت کرتے رہنے کی مستقل خصلت پیدا ہو گئی بلکہ طبائع کچھ شاہ پرست سی ہو گئیں۔ ایک

---

[1] A SHORT HISTORY OF SARACENS – BY AMEER ALI SYED – PP 406-408

مزید تفصیلات کے لیے: وفیات ابن خلکان۔ ترجمہ غراء نحوی۔

[2] المامون۔ از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۴۵۔ بہ حوالہ: آثار الدول کرمانی (ذکر خلافت المامون)

[3] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین ندوی۔ حصہ ۳ ج ۱ ص ۱۲۱

گروہ جہاں احیائے اسلام کے لیے انقلابی نظریہ کا داعی اور اس پر عمل پیرا بھی رہا، وہاں دوسرے گروہ کا مخلصانہ نظریہ یہ قرار پایا کہ "حکومت کے ظلم و جور پر اعتراض نہ کرنا چاہیے" خواہ وہ خدا کے حرام کردہ خون کو بہا رہی ہو۔[1]

عجمیت بنو عباس کی حکومت اہلِ فارس کے کندھوں پر قائم ہوئی تھی۔[2] جاحظ اسے "عجمیۃ خراسانیۃ" کہتا ہے۔[3] بنو عباس فارسی اثرات سے مغلوب ہو گئے اور یہ اثرات سیاسی دائرے ہی میں نہیں، فکر اور ثقافت کے دائروں میں بھی گھس گئے اور انہوں نے اسلامی حکمت و تہذیب کی چولیں ہلا ڈالیں۔ امویوں کے ہاں قیادت اور نظمِ ملکی عربوں کے ہاتھ میں تھا اور اس معاملے میں غلو اور زیادتی سے کام لے کر ایرانیوں کو بددل کر دیا گیا۔ اس غلطی نے عباسیوں کے ہاں اپنا رخ الٹی سمت میں پھیر دیا۔ اب عربوں کو پیچھے ہٹا دیا گیا اور اہلِ فارس دربار، نظم و نسق اور فوج پر حاوی ہو گئے۔ تاریخی کلیہ ہے کہ کسی حکومت کے قیام، اس کے بقا یا اس کے استحکام میں جو قوت سہارا بنتی ہے وہی پسِ پردہ حکومت پر چھا جاتی ہے۔ وہ قوت خود رائے عام کی قوت ہو، کسی طبقۂ خاص کی قوت ہو، کوئی غیر ملکی قوت ہو، سکہ اسی کا چلتا ہے۔ چنانچہ ایرانیوں نے حکومت اور معاشرے کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ بیرونی نفوذ کا جو راستہ ایرانیوں کے لیے کھلا، اس سے پھر یونانیوں، ترکوں، مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے فکری و ثقافتی اثرات کے قافلے پے در پے داخل ہونے شروع ہوئے۔ نقشہ زیر و زبر ہو گیا۔ معاشرہ ایک معزز گھرانے کے بجائے ایک کارواں سرائے کی صورت اختیار کر گیا۔ چونکہ خود قیادت کا ذہن مرعوب تھا اس لیے بیرونی اثرات کا مقابلہ معاشرہ کی طرف سے مضبوطی سے نہ کیا گیا۔ چنانچہ اس دور میں ایسے ایسے اعتقادی

۱؎ تفسیر احکام القرآن ۔ ابوبکر جصاص ج ۲ ص ۳۴ و ۴۲

۲؎ ضحی الاسلام ۔ از ڈاکٹر محمد امین مصری ۔ ج ۱، ص ۳۵

۳؎ البیان والتبیین ۔ ج ۳، ص ۲۰۶

اور اخلاقی فتنے اٹھے کہ آج تک ان کے اثرات سے نجات نہیں ہو سکی۔

ثنویت اموی دور میں اگرچہ شخصی بادشاہت آئی مگر وہ بیٹھی خلافت ہی کی مسند پر تھی، اور ذہنوں میں اسی کا اثر تھا۔ مگر عباسی دور میں جب مطلق العنان اقتدار جوان ہو گیا تو وحدت نظام باقی نہ رہی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ثنویت آ گئی۔ یعنی تاریخ کی ندی دو دھاروں میں بٹ کر بہنے لگی۔ ایک دنیویت کا دھارا، دوسرا مذہبی دھارا۔ آہستہ آہستہ خلیفہ اور سلطان دو الگ الگ ادارے پیدا ہو گئے۔ خود علم میں تقسیم ہو گئی۔ دنیوی عقلی علوم (فلسفہ، طب، ریاضی، فلکیات) خلفاء، امراء اور اغنیاء کی سرپرستی میں نشوونما پانے لگے اور علم دین (تفسیر و حدیث) ایوان سے باہر پرورش پانے لگا۔ دنیوی علم کے حاملین عیش میں تھے اور دینی علم کے حاملین فقر و فاقہ کے شکار[۱]۔ ادب کی دو قسمیں الگ الگ ہو گئیں ایک نزعۃ اللہو، یعنی رندانہ یا رومانوی ادب اور دوسری نزعۃ الزہد، یعنی صوفیانہ ادب[۲]۔ دنیائے فکر کے دو حصے ہو گئے، ایک طرف ایمانِ خالص اور اعتقادِ صادق تھا اور دوسری طرف شک اور زندقہ و الحاد ــــ بلکہ الحاد و زندقہ کی ایک طوفانی تحریک۔ دونوں رجحانات کے درمیان ایسا تصادم تھا گویا جنگ برپا ہے[۳]۔ بہ حیثیت مجموعی پوری زندگی کے دو رنگ الگ الگ ہو گئے: ایک وہ زندگی جس میں لہو و طرب تھا، لذات تھیں، نعمتیں تھیں، آسودگی تھی، دوسری طرف وہ زندگی جس میں مشقت تھی تھا، زہد تھا، تکالیف اور مصیبتیں تھیں۔ عباسی ثقافت کی تصویر اسی دو رنگی اور تضاد سے بنی تھی ــــ ایک طرف مسجدیں تھیں تو دوسری طرف میکدے۔ ادھر قاریانِ قرآن تھے تو ادھر زمزمہ زنانِ طاؤس و رباب، کچھ لوگ نمازِ صبح کے منتظر رہتے تو کچھ باغوں میں صبوحی پینے کے لیے مضطرب، کوئی تہجد کے لیے جاگتا اور کوئی عشرت کے لیے۔ ایک طرف

---

۵۱ ضحی الاسلام - از ڈاکٹر احمد امین مصری - ج ۱ ص ۱۴۱، ۱۴۲ ۵۲ ایضاً

۵۳ ایضاً - ج ۱ ص ۱۴۳

بسیار خوری بدہضمی کا شکار تھے اور دوسری طرف غریبی کے مارے ہوئے فاقہ مست، ایک طرف ریب و شک اور دوسری طرف ایمان و یقین — عباسی دور میں ہر چیز تھی اور ہر چیز وافر تھی۔[۱]

حکمراں طاقت کا حال یہ تھا کہ وہ تضاد کے خوفناک روگ میں مبتلا تھی۔ جب مطلق العنان اقتدار کی فطرت رو کرتی تو وہ انسانی جانوں اور ملت کے اموال پر بے محابا تصرف کرتے، اور جب ان کو مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کا خیال آتا اور ایمان، ضمیر اور سابق روایات تحریک کرتیں تو خدمت دین پر آمادہ ہو جاتے۔ وہ گردنیں اڑاتے بھی تھے اور جاں بخشیاں بھی کرتے تھے، وہ کوڑے بھی مارتے تھے اور عطیات بھی دیتے تھے۔ وہ مال چھینتے بھی تھے اور عطا بھی کرتے تھے۔ وہ عیش و عشرت میں بھی مدہوش رہتے تھے اور خدمتِ اسلام بھی کرتے تھے۔ وہ بگاڑ بھی پھیلاتے تھے اور پھر اصلاح بھی کرتے تھے۔ عباسی دور کا تضاد اکثر خلفا اور خصوصاً ہارون الرشید کی شخصیت میں متشکل تھا۔ وہ ایک طرف عبادت کرتا تھا تو دوسری طرف موسیقی سے لطف اندوز ہوتا، ایک طرف وعظ سن کر رونے لگتا، دوسری طرف نبیذ سے شادکام ہوتا۔[۲] اسی طرح ایک طرف مامون کی دینی و علمی خدمات دیکھیے اور دوسری طرف فاسقانہ ثقافت اور اعتقادی فتنوں کی سرپرستی ملاحظہ کیجیے، جن کے متعلق شبلی جیسا آدمی بھی یہ کہتا ہے کہ اس نے ایسی بے اعتدالیاں کی ہیں کہ اس کی خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔[۳] اسی طرح نہایت دلچسپ شخصیت ناصر باللہ کی تھی، شراب اور موسیقی کی ممانعت کر دی مگر خود لونڈیوں کے ایک گروہ کے اندر شراب کے نشے میں گم رہتا۔[۴]

---

[۱] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۱۶۷

[۲] ایضاً ص ۱۱۷، ۱۱۸

[۳] المامون از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۲۵ — [۴] تاریخ الخلفاء ص ۳۰۰ و ۲۸۶

ان خلفاء کے مختلف ادوار کو دیکھیے تو پالیسی میں بار بار ردِ عمل ہوتا دکھائی دیگا کبھی زنادقہ کی سرپرستی ہے اور کبھی زنادقہ کے خلاف نہایت تند مہم، کبھی ثقافت کی سوتیز ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا انسداد شروع ہو جاتا ہے، کبھی دربار میں بدعنوانیاں زور پکڑتی ہیں اور کبھی نظم و نسق کی درستی کی فکر کی جاتی ہے۔ ایک کی پالیسی ایک رُخ پہ جاتی، دوسرے کی دوسرے رُخ پر۔ ایک کے کیے کرائے کو دوسرا ملیامیٹ کر دیتا۔

ان حالات میں اسلام پورے نظامِ زندگی کی کارفرما طاقت کیسے ہو سکتا تھا، وہ ایک محدود گوشے میں سمٹ گیا جو اپنی جگہ تھا بڑا اہم۔ یعنی قانون و عدالت کے دائرے میں، کیونکہ اسلامی قانون کو چھوڑ کر کسی اور طرف جانا ممکن نہ تھا۔

اس ثنویت کے متعلق بھرپور تنقید ہمیں بعد کے دور میں صرف ابن تیمیہؒ کے ہاں ملتی ہے جنہوں نے دین و سیاست کی علیحدگی کو باعثِ فساد قرار دیا۔ السیاسۃ الشرعیہ میں ہے:

"جب کبھی دین و سیاست میں جدائی ہوتی ہے، دو گروہ معرضِ وجود میں آجاتے ہیں: ایک گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو دیندار تو ہوتے ہیں لیکن قوتِ حرب، جاہ اور مال سے ــ جن کا دین خداوندی ضرورت مند ہے ــ دین کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ دوسرا گروہ ایسے والیانِ ریاست پر مشتمل ہوتا ہے جو مال اور حربی قوت کو بروئے کار لاتے ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصد اقامتِ دین نہیں ہوتا۔ یہ دونوں گروہ مغضوب علیہم والضالین ہیں[1]۔"

دولت و اسراف عباسی دور میں ایک طرف فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، دوسری طرف خراج کی آمدنی بیش بہا تھی، تیسری طرف صنعت، تجارت اور زراعت میں اضافہ ہوا۔ اس لئے دولت کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ خراج کی سالانہ آمدنی ہارون الرشید کے عہد میں

[1] السیاسۃ الشرعیہ

۷ ہزار ۵ سو قنطار (قنطار = ۸۰۰۰ دینار) تھی[1] سلطنت کی وسعت اور بین الاقوامی میل جول سے تجارت کو ترقی ہوئی، "طریق الحریر" پر چین تک سے تجارتی رابطہ قائم ہو گیا[2] بصرہ کے بعض متوسط تاجروں کی اوسط آمدنی ۱ لاکھ درہم سالانہ تھی اور بحری تاجر ۴ لاکھ دینار سالانہ تک کما لیتے تھے[3] لباس، فرش فروش، قالینوں، برتنوں، فرنیچر، شیشہ سازی، کاغذ سازی اور خوشبوئیات کی صنعتیں خوب بڑھیں[4] ترقی زراعت کے لیے دجلہ سے نہریں نکال کر ان کا جال پھیلا دیا گیا[5]

دولت کا یہ سیلاب بالائی طبقہ کے ہاتھوں اسراف کی رودگاہوں میں بہنے لگا۔ تنخواہوں کا یہ حال تھا کہ وزیر اعظم ذو الریاستین (بعہد مامون) کو ۳ لاکھ درہم ماہوار ملتے تھے[6] ابن ابی صیبعہ کی تاریخ میں ہے کہ شاہی طبیب جبریل بن بختیشوع (متوفی ۲۱۵ھ) کو خلیفہ کی طرف سے تنخواہ اور الاؤنس ملا کر ۱ لاکھ ۱۵ ہزار درہم ماہانہ ملتے تھے (روزہ، یوم الفطر اور خلیفہ کے یوم فصد کے الاؤنس الگ ہوتے)۔ بیگمات اور وزرا کی رقوم بھی ملائی جائیں تو میزان ساڑھے تین لاکھ درہم ماہانہ بنتی ہے[7] فضل بن سہیل وزیر اعظم ۳ لاکھ درہم ماہانہ پاتا تھا[8]

پھر شاہی مصارف کا حال یہ تھا کہ مامون کے دستر خوان کا روزانہ خرچ ۱۰ ہزار درہم تھا[9] مامون نے حسن بن سہیل کی لڑکی سے نکاح کیا تو ۱۹ دن تک بارات سمدھیانے میں رہی جہاں داد و دہش کی بارش ہوتی رہی۔ اس نکاح کا حال ابن خلدون، ابو الفداء، ابن اثیر

[1] معجم البلدان ج ۱ ص ۲۲۶ [2] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از فلپ کے ہٹی ص ۱۲۵۔

[3] ایضاً ص ۱۲۷ [4] ایضاً : ص ۱۲۷

[5] ایضاً ص ۱۲۹ [6] المامون از علامہ شبلی نعمانی ص ۲۷،

[7] ایضاً ص ۱۶۲ [8] ایضاً ص ۲۲۱

[9] ایضاً ص ۱۹

اور ابن خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ۵ کروڑ درہم کا صرفہ اٹھا محمد بن وہیب کے قصیدہ پر فی شعر ایک ہزار درہم انعام دیا گیا[1] پھر ذرا زبیدہ کی عیاشیوں اور اسراف و تبذیر کا حال پڑھیے[2]۔ جہاں ایک خلیفہ (المتوکل) کے گرد چار ہزار کنیزیں جمع ہوں[3]، جہاں ملکہ کے ایک لباس کا تھان ڈیڑھ لاکھ اشرفی میں تیار ہو[4] اور جہاں بادشاہ (مامون) کے شبستان کے لیے ایک کنیز ایک لاکھ درہم میں خریدی جائے[5] وہاں اسراف کا حال کیا ہوگا؟

یہ بجا کہ رفاہِ عامہ کے کام بھی ہوتے اور خوب ہوئے، تعمیرات ہوئیں، علوم کی ترقی پر خرچ کیا گیا مگر دیکھنے کی چیز ہے تناسب! پھر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ بیت المال (پبلک فنڈ) کے استعمال میں کیا اختیارات تھے اور کیا معمولات تھے! اس معاملے میں بادشاہوں (خصوصاً مامون) کو ہیرو قرار دینے والے شبلیؒ تک فرماتے ہیں کہ: "کل بیت المال (پبلک فنڈ) ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیا گیا[6]" اس معاملے میں بیچارے اسلام کو کون پوچھتا تھا۔ خلیفہ کی مذہبیت مالیات کے دائرے میں کم ہی قدم رکھ سکتی تھی۔

رندانہ ثقافت | اقتدار مطلق العنان ہو، اس پر الہامی ہدایت کی بالادستی باقی نہ رہی ہو بلکہ مذہب کو ایک الگ خانے میں محدود کر دیا گیا ہو، بیرونی افکار اور غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات موج در موج چلے آ رہے ہوں اور دولت کے انبار خزانوں میں ہوں تو پھر ثقافت اخلاقی حدوں میں محدود رہ جائے یہ ناقابلِ تصور ہے۔ ایسے حالات میں ثقافت کی روح اہواء پرستانہ، شہوانی اور رندانہ ہی ہو سکتی ہے۔ ایسی ہی ثقافت تھی جو دمشق میں پروان چڑھی اور بغداد میں شباب کو پہنچی۔

عباسی ثقافت کے وہ کارنامے جو پبلک تعمیرات کے دائرے میں سامنے آئے۔

---

[1] المامون از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۴۲

[2] عرب اور اسلام (ترجمہ) از فلپ کے ہٹی ص ۱۰۳

[3] مسعودی ج ۲ ص ۳۰۸

[4] مسعودی۔ ذکر خلافت قاہر باللہ

[5] المامون۔ از شبلیؒ ص ۲۰۲

[6] ایضاً ص ۲۰۰۔

وہ اپنی جگہ بڑے قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً بغداد، کرخ اور رصافہ وغیرہ شہروں کی تعمیر، نیز عمارات، سڑکوں، نہروں، شفاخانوں اور رصدگاہوں کی تیاری اور علمی مراکز کا قیام وغیرہ پھر خطاطی اور نقاشی کے فنون کو جو ترقی ملی وہ بھی پُرافادیت تھی۔ علاوہ ازیں عباسیوں نے معاشرہ میں اچھے رہن سہن کے لیے جو رجحان پیدا کیا اور ذوقِ جمال کو عام کر دیا، اس سے زندگی خوش آئند ہو گئی۔ مگر ان کاموں میں بھی اعتدال و توازن نہ تھا اور پھر اس کا اہتمام نہیں کیا گیا کہ دنیوی زندگی کی آراستگی اخلاقی تقاضوں سے معاشرہ کو غافل نہ کر دے۔ چنانچہ یہ غفلت روز بروز بڑھتی گئی۔

لیکن ثقافت کا دوسرا دھارا مکمل طور پر نفس پرستی اور شہوت رانی کا دھارا تھا۔ درحقیقت بیرونی عناصر عین سلطنت کے درمیان بیٹھ کر یہ طوفان اٹھا رہے تھے اور اس طوفان کا مرکز شاہی محل تھا۔ اوّلاً اہلِ فارس نے یہ مہم چلائی، انھوں نے "ماحول کو موسیقی، نبیذ اور لہو و طرب سے بھر دیا[1]" خصوصاً برامکہ نے دورِ عروج میں فارسی ثقافت کو خوب پھیلایا[2]۔ ایرانی اثر کا حال یہ تھا کہ عید نوروز کو پُررونق قومی تہوار بنا لیا گیا[3]۔ پھر اس ثقافتی مہم کی امامت عورتوں کے ہاتھ میں تھی۔ ملکہ خیزران کے سیاسی اثر کا حال کس کو معلوم نہیں۔ خود ملکہ زبیدہ نے سیاست کے ساتھ ثقافت میں عظیم حصہ لیا۔ اس کی عنبری شمعیں، اس کی جواہر سے مرصع جوتیاں، اس کے چاندی، آبنوس اور صندل کے بنواتے ہوئے نفیس جو دیبا و سمور سے آراستہ رہتے، ان کے چرچے تاریخ کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں[4]۔ اکثر خلفاء پر عورتوں کا اثر گہرا تھا۔ المامون کے بارے میں ہارون الرشید کا قول تھا کہ "لونڈیاں اور عورتیں اس کی مشیر ہیں[5]"۔ عباسیوں

---

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۱۹۱ [2] ایضاً ص ۲۰۲

[3] البیان والتبیین ج ۳ ص ۶۵ (اور اس سے آگے) [4] مروج الذہب المسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ

[5] تاریخ سیوطی، ص ۳۱۱ -

نے کنیزوں کے ریوڑ محلات میں بھر لیے تھے۔ مثلاً مذکور ہو چکا کہ خلیفہ متوکل کے ہاں ۴ ہزار کنیزیں تھیں۔ خلیفہ ہارون ایک بار دو ہزار مہوش دوشیزاؤں کے رقص سے لطف اندوز ہوا جس کا ہدایت کار وہ خود تھا[۱]۔ اس سے بھی بڑے ایک نسوانی رقص سے المامون بہرہ اندوز ہوا[۲]۔ نخاس باقاعدہ معاشرہ کا وسیع ادارہ تھا جہاں ہندی، سندھی، مکی، مدنی، سوڈانی، حبشی، ترکی، رومی اور ارمنی عورتیں اس طرح بکتیں جیسے مرغیاں، بٹیر اور پیاز اور شلجم بکتے ہیں[۳]۔ لونڈیوں کو حرائر پر ترجیح دی جانے لگی، کیونکہ ایک تو بقول جاحظ ان کو پسند کر کے لیا جا سکتا تھا، دوسرے یہ فن تعشق، اظہار جمال اور موسیقی کی تعلیم سے آراستہ ہوتیں اور اس طرح حسن صورت کے ساتھ فنی حسن مل کر لطف کو دوبالا کر دیتا۔ علامہ شبلیؒ نے بھی لکھا ہے کہ کنیزوں کا مرتبہ اصلی ازواج سے بڑھ کر تھا[۴]۔ چنانچہ خلفاء، امراء اور اغنیاء کے محلات مختلف قوموں اور نسلوں اور مذہبوں سے آنے والی اور مختلف طبائع رکھنے والی اور مختلف بولیاں بولنے والی عورتوں سے بھر گئے[۵]۔ یہ لونڈیاں جو بقول جاحظ لازماً عصمت باختہ ہوتی تھیں، اپنے اندر سفلگی اور بازاری پن کا جو رنگ رکھتی تھیں وہ محلات پر اور پورے معاشرے پر پڑ رہا تھا۔ عورت انسانیت کے کندھوں پر سوار تھی۔ امین جیسے رند کو موقع ملا تو اس نے ثقافتی ترقی کے لیے نوجوان لڑکیوں کی باقاعدہ تنظیم قائم کر ڈالی جو زلفیں کٹاتی تھیں، لڑکوں کا سا لباس پہنتیں اور ریشمی عمامے باندھتی تھیں[۶]۔ جب کسی ثقافت میں شہوت پرستانہ رجحانات عورت کو بزم عشرت کی شمع بنا لیتے ہیں تو پھر وہ اندھیرا پھیلتا ہے کہ جسے سورج بھی نہیں مٹا سکتا۔

---

[۱] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از فلپ، کے، حتی۔ ص ۱۰۸ [۲] ایضاً ص ۱۲۴

[۳] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۸۹

[۴] المامون۔ ص ۲۰۴

[۵] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر محمد امین مصری ج ۱ ص ۹۸

[۶] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر فلپ، کے، حتی۔ ص ۱۲۴

آئیے ذرا اس ثقافت کا ایک منظر دیکھیے کہ معاشرے کا سربراہ کار (المامون) کس طرح بزم ثقافت کو فروغ دیتا ہے:

"بزمِ عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھتا ہے، بے تکلف اور رنگین احباب جمع ہیں، پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے، دورِ شراب چل رہا ہے۔ ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں۔ یارانِ باصفا بدمست ہونے جا رہے ہیں[1]۔"

جب قیادت یوں جام چھلکانے لگے تو معاشرہ خم لنڈھانے پر اتر آتا ہے۔ محل کا رنگ سارے بغداد پر اور بغداد کا رنگ پوری مملکت پر چھا جاتا ہے۔ موسیقی خوب پھیلی اور ضروریات زندگی میں داخل ہو گئی۔ یہاں تک کہ پبلک مقامات پر، راستوں میں، خلفاء کے محلوں میں، امیروں اور غریبوں کے گھروں میں مغنی اور مغنیات نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ خلفاء (مثلاً واثق اور مستنصر) اور ان کی اولادیں نغموں کے سُر ایجاد کرتے ہیں[2]۔ عُلَیَّہ (بنتِ خلیفہ مہدی) ۳۰ راگ گا سکتی تھی[3]۔ غرض فنونِ لطیفہ، غنا، مصوری اور رقص کی ایک تحریک چل پڑی[4]۔ خلیفہ معتصم نے محل کی دیواروں پر شکار کے مناظر کے علاوہ عریاں عورتوں کی تصویریں ایک نصرانی مصور سے بنوائیں[5]۔ کتوں اور مرغوں کو سدھانے کے لیے استاد اور بازی گر وغیرہ جمع کیے گئے[6]۔ نرد اور شطرنج کے کھیلوں میں شدید انہماک پیدا ہوا، کبوتر پالے جاتے اور ان کی بھاری قیمتیں مقرر کی جاتیں، قمار بازی اتنی پھیلی کہ غرباء کے جھونپڑوں تک جا پہنچی، نقاشی اور مصوری کو ترقی ہوئی، حتیٰ کہ والدہ واثق کی خواہش پر امام احمد بن حنبل کو بلوانے کے لیے جو شاہی سواری بھیجی گئی اس کی جھولی پر چیتے کی تصویر

۱۔ المامون۔ از علامہ شبلی نعمانی۔ ص ۲۰۱ — ۲۔ کتاب الاغانی ج ۸ ص ۱۶۲

۳۔ ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۹۷ — ۴۔ ایضاً۔ ص ۹۵

۵۔ عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر فلپ کے ہٹی ص ۱۴۸ — ۶۔ ایضاً ص ۱۰۷

تھی (امام نے اسے استعمال نہیں کیا)۱؎۔ مجسمہ سازی بھی شروع ہو گئی۔ دارالشجرہ میں ۱۵ مصنوعی سوار ایستادہ تھے۲؎ معتضد کی ماں نے ننھے پوتے کے لیے ایک پورے گاؤں کا ماڈل چاندی سے بنوایا جس میں مکانات، آدمی اور تمام سامان چاندی کے بنے تھے۳؎ ملک میں عشرت کدے کھل گئے جن میں شراب کے دور چلتے اور طوائفیں گا تا سناتیں۔ پروفیسر حتی نے لکھا ہے کہ زیادہ تر ان قحبوں کو یہودی اور عیسائی چلاتے تھے (عرب اور اسلام ص ۱۲۰) ان کے قیام کے لیے امین نے خاص کام کیا۴؎ ایسا ایک عشرت کدہ کوفہ میں "ابن رامین" کا تھا جس کی مشہور ترین مغنیہ "سلامۃ الزرقاء" تھی۵؎ اس ثقافت کی تصویر ادب نے الف لیلہ کے آئینہ میں محفوظ کر دی ہے جسے الجہشیاری (وفات ۹۴۳ء) نے لکھا تھا اور جس میں بعد کے لوگوں نے اضافے کیے ہیں۔

اس ثقافت کا اثر شعر و ادب پر بہت ہی برا پڑا۔ مثلاً ابراہیم ابن سیابہ جو آزاد منش، بے باک اور غلاموں سے دل بستگی رکھتا تھا، اسلام پر زندیقانہ حملے کرتا۔ عام شعراء نے لوگوں کو فسق و فجور اور اباحت کی طرف دعوت دینے میں حد کر دی۔ یہ لوگ دین پر سخت تعریض کرتے اور حرمتِ شراب کے اسلامی قانون اور آخرت کے اعتقاد کا بری طرح مذاق اڑاتے۶؎۔

ابو نواس کا ایک شعر لیجیے:-

فَاِنْ قَالُوا حَرَامٌ، قُلْ حَرَامٌ   وَلٰکِنَّ اللَّذَاذَۃَ فِی الْحَرَامِ

(یہاں تو اگر لوگ کہتے ہیں کہ شراب حرام ہے تو تو بھی مان لے کہ حرام ہے۔ مگر لطف و کیف تو حرام ہی میں ہوتا ہے)

ایک اور شعر لیجیے:

۱؎ المسادلیعہ از رئیس احمد جعفری۔ ص ۵۰۹ ۲؎ معجم البلدان۔ ذکر دار الشجرہ

۳؎ البدایہ والنہایہ۔ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۱۷۰۔ ۴؎ طبری ج ۵ ص ۹۵۳

۵؎ الاغانی ج ۱۳ ص ۱۲۷ ۶؎ ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۱۵۲، ۱۵۳

۷؎ ایضاً ص ۱۹۲ ۸؎ ایضاً ص ۱۹۳

اَلَا فَاسْقِنِي خمراً، وقل لي هي الخمر   ولا تسقني سِرًّا اذا امكن الجهرُ

(دیکھو، مجھے شراب پلاؤ، اور یہ کہہ کر پلاؤ کہ یہ شراب ہے۔ جب کھلم کھلا پینا ممکن ہے تو پھر اسے چھپاتے ہوئے یہ پردہ راز نہ رکھو)

یہ تو پھر بھی ذرا گوارا اشعار ہیں، بصرہ میں بشار بن برد نے فحش شاعری کا طوفان اٹھا رکھا تھا اور مغنیات اس سے گانے کے لیے شعر حاصل کرتی تھیں [1]۔ عرب جاہلیت کی شاعری میں رندیت تھی مگر ایک حد تک۔ اب تو یہ ہوا کہ شہوانیت تمام اسالیب و مظاہر میں رچی ہوئی تھی اور بدترین لفظ بدترین مفہوم کے ساتھ لیا جاتا تھا [2]۔

اس رندانہ یا شہوانی مکتبِ شعر و ادب کے بالمقابل ایک ردِ عمل کے طور پر صوفیانہ مدرسۂ فکر بھی کام کرنے لگا جس کا ایک مشہور فرد ابو العتاھیہ تھا۔ اس کی شاعری زندگی سے بیزاری اور کنارہ کشی کا پیغام دیتی ہے، کیونکہ حالات کی رَو میں بہنے کے لیے جو لوگ تیار نہیں ہوتے وہ جب اصلاح کے لیے کوئی راستہ نہیں پاتے تو تصوّف کی پناہ لیتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت فسق و فجور کی طرف جانے والے بھی اور تصوف کی طرف رُخ کرنے والے بھی ــ دونوں ہی زندگی کے تلخ حقائق سے فرار چاہتے ہیں ــ ایک میخانے میں پناہ لیتا ہے، دوسرا خانقاہ میں۔ ابو العتاہیہ کے یہ مشہور ابیات سنیے:

رغیف خبزٍ یابسٍ   تاکلہ فی زاویہ
وکوز ماءٍ باردٍ   تشربہ من صافیہ
وغرفۃ ضیقۃٌ   نفسك فیھا خالیہ
او مسجد بمعزلٍ   عن الوری فی ناحیہ
معتبرا من مّضیٰ   من القرون الخالیہ
خیر من الساعات فی   فیءِ القصور العالیہ

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۱۰۳   [2] ایضاً ص ۱۰۴

یعنی اگر ایسا ہو کہ تو ایک گوشۂ خلوت میں سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھائے، صاف چشمے سے پانی کا ایک کوزہ بھر کر پیاس بجھالے، ایک تنگ سے جھونپڑے میں تن تنہا بیٹھے، یا لوگوں سے الگ ہو کر کسی دور افتادہ مسجد میں اللہ اللہ کرے۔ جو لوگ اگلے زمانوں میں گزرے ہیں ان سے عبرت پکڑے، تو یہ عالیشان محلوں میں وقت گذارنے سے بہتر ہے۔

نفس پرستانہ اور رندانہ ثقافت کے نتیجہ کے طور پر سخت اخلاقی بحران نمودار ہوا اور جنسی اخلاق بری طرح تباہ ہوئے۔ حکمراں طبقہ جب یوں اخلاقی تباہی کا علمبردار بن جائے تو اصلاح پسندوں کی بے بسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو تصوف کی طرف گئے اور کچھ وہ تھے جو اضطراب اور بے بسی کی وجہ سے دہشت انگیزی (TERRORISM) کے ذریعے اصلاح کرنے پر اتر آئے۔ بغداد میں انارکی پھیل گئی جس کا ذکر گبن نے بھی کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی جماعت کے بعض نوجوان ایک بار بے قابو ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور عیش پرست امراء کے گھروں میں گھس کر شراب کے برتنوں اور موسیقی کے آلات کو توڑنے کی مہم شروع کر دی۔ ان میں سے بعض نے مغنیوں اور طوائفوں کو پیٹا بھی[2]۔ مطلق العنان اقتدار کے تحت ایسا ہونا بعید نہیں ہوتا۔ غالباً اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ اہلِ بغداد نے شراب نوشی اور مغنیہ عورتوں کی کثرت سے پریشان ہو کر وفد کی شکل میں خلیفہ سے احتجاج اور مطالبہ کیا کہ شراب اور بدکاری کے اڈے بند کر دیئے جائیں۔ اس وفد نے ایک اور واقعہ پر فریاد بھی کی۔ ایک شہری نے کسی سپاہی کی داشتہ کے عود کے تار توڑ ڈالے، سپاہی نے شہری کو پیٹ ڈالا۔ اہلِ بغداد کا مطالبہ تھا کہ اس سپاہی کو سزا دی جائے مگر خلیفہ بیچارا خود بے بس تھا[3]۔

---

[1] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) از پروفیسر فلپ کے، حتی ص ۱۷۷ و ۱۲۰

[2] مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر علی ابراہیم حسن۔ ص ۸۴ (تمام بڑی تاریخوں میں یہ ذکر موجود ہے)

[3] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۲۰۔

ایسی تھی بغداد کی ثقافتی جنت جس کے متعلق کسی کہنے والے نے کہا تھا کہ لیس بغداد منزل العباد (بغداد خدا پرستوں کی جگہ نہیں ہے)۔ بشر بن حارث کا مقولہ تھا کہ کسی مومن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ بغداد میں رہے بسے[1]۔

بات لمبی ہوگئی، مگر اس مسرفانہ اور رندانہ ثقافت کا جو وبال غریب طبقوں پر پڑ رہا تھا اس کا ذکر کیے بغیر یہ ثقافتی جائزہ مکمل نہ ہوسکے گا۔ وہ بغداد جس کی تعمیر میں ۴ سال تک ۱ لاکھ معمار[2] اور مزدور مصروف رہے تھے اور جس پر ۲ کروڑ درہم خرچ ہوئے تھے[3] اور جس میں ۳ ہزار مسجدیں، ۱۰ ہزار حمام اور ۸۶۰ مطلب تھے اور جہاں بالائی طبقہ ــ جس کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ملک کے بڑے شہروں میں ۲۰ تا ۵۰ ہزار تھی[4] ــ داد عیش دے رہا تھا، وہاں عظیم طبقاتی تفاوت کی وجہ سے عوام میں افلاس و بدحالی کا دور دورہ تھا[5]۔ ابو العتاہیہ نے غریب طبقوں کو سامنے رکھ کر ٹرا دردناک شہر آشوب کہا ہے۔ دوسرے شعراء نے بھی ان حالات کا ماتم کیا ہے۔ صرف ایک قطعہ یہاں دیا جاتا ہے:

تصلح للموسر لا لامرئ بِہٖ — یبیت فی خفض وا فلاس
لو حلّھا قارونُ ربُّ الغنیٰ — اصبحَ ذا ھَمٍّ و وسواس
حورٌ و ولدانٌ و من کلّ ما — نطلبُہٗ فیھا سوی الناس

یعنی خوش حال آدمی کے لیے تو یہ جگہ اچھی ہے مگر اس شخص کے لیے سازگار نہیں جو فقر و فاقہ میں گذران کرتا ہے۔ اس میں اگر اتفاقاً قارون جیسا صاحب دولت آ اترے تو وہ مصیبت اور پریشانی کا شکار ہو جائے۔ یہاں نہیں حور و غلمان اور جو جو کچھ چاہو مل سکتا ہے، مگر بس ایک انسان نہ ملیں گے۔

---

[1] تاریخ بغداد۔ ج ۱ ص د — [2] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ)۔ ص ۲۰۰

[3] نجوم زاہرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ ص ۲۷۷

[4] عرب اور اسلام (انگریزی سے ترجمہ) ص ۹۲ — [5] ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری ص ۱۳۱

ابوالعتاہیہ کا ایک شعر اور جو اس نے ہارون کے سامنے ایک نظم میں پڑھا تھا اور اسے رلا دیا تھا ؎

کیف اصلاحُ قلوبٍ انما هُنَّ قروح

(دلوں کی اصلاح کیا ہوگی جبکہ وہ ہمہ تن ناسور بن چکے ہیں)

آج سوچو! کیا یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا کردہ ثقافت تھی؟ یہ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کی سیراب کردہ ثقافت تھی؟ — کیا یہ اسلامی ثقافت تھی؟ اور کیا اس ثقافت کے لباس میں انسانیت کا وہ پیکر زندہ رہ بھی سکتا تھا جو قرآن کا مطلوب ہے؟ — ہرگز نہیں: — یہ غیروں کی ثقافت تھی، یہ باہر سے آئی، پاسبانِ ملت معاشرہ کا بچاؤ اس سے نہ کر سکے اور "سمرقند و بخارا" اس کے خالِ ہندو پر لٹا دیا۔ یہ ایک زقاصہ کی طرح آئی اس نے اپنے غمزوں کے ساغر بھر بھر کے لنڈھائے اور پورا معاشرہ بدمست ہو کر اس کے گرد ناچنے لگا اور ۵ سو برس لمبی شبِ عشرت بیت گئی — مگر لوگوں کی آنکھیں اس وقت سے پہلے نہ کھل سکیں جب قانونِ قدرت نے فتنۂ تاتار کا کوڑا (۶۹۳ھ) ان کی پیٹھوں پر برسایا، کہ اس کے ناقابلِ بیان ہونے کو ایک شاعر یوں بیان کرتا ہے:

وکان ما کان مِمّا لستُ اذکرہ فظُنَّ خیرًا ولا تسألْ عن الخبر[1]

(جو ہونا تھا سو ہوا، میں اسے بیان نہیں کرتا تم بس اچھا ہی گمان کرو اور حالات دریافت نہ کرو۔)

مختلف عناصر کا اختلاط اسلامی معاشرہ ابھی ابتدائی تربیت پا ہی رہا تھا کہ اس میں باہر سے نئے اور کچے عناصر کا داخلہ تیزی سے شروع ہو گیا۔ اختلاطِ عناصر کے اس خطرے کو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے محسوس کیا۔ مگر بعد کے ادوار میں رفتار اور تیز ہو گئی۔ عرب اور موالی، اہلِ فارس اور ترک، اہلِ کتاب اور مجوس اسلامی معاشرہ کے ساتھ خلط ملط ہوتے

[1] الفخری ص ۲۹۷

چلے گئے۔ تعلیم و تربیت کا وہ مستحکم نظام جو خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا اور جس کے تحت ہر علاقائی حکمراں کی ابتدائی ذمہ داریوں میں یہ بات شامل تھی کہ رعایا کو قرآن وسنت کی تعلیم دیں اور ان میں اقامتِ عبادات کا انتظام کریں، توسیع معاشرہ کے ساتھ ساتھ اسے اور زیادہ پھیلانے اور مضبوط و مؤثر بنانے کی ضرورت تھی، مگر یہ روز بروز کمزور ہوتا گیا اس سے تین تباہ کن نتائج پیدا ہوتے:

پہلا یہ کہ عصبیتوں کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بلا خود عربوں میں قبیلہ پرستی کی شکل میں موجود تھی جس کا زور بمشکل ابھی ایک حد تک توڑا جا سکا تھا۔ لیکن ایک بار جب یہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی حریفانہ کشاکش سے قیادت کی صفوں میں از سرِ نو اٹھ کھڑی ہوئی تو پھر نیچے تک پھیلتی چلی گئی۔ مثلاً کوفہ میں یمانیوں اور نزاریوں کے درمیان قبیلوی عصبیت برابر نزاع تشدید کا باعث بنی رہی[1]۔ پھر ہر علاقے کے عربوں اور ان کے موالیوں میں باہمی تعاون کی وجہ سے جو رابطہ پیدا ہو جاتا۔ اس کے تحت وہ دوسرے علاقے کے متحدہ عربوں اور موالیوں سے بر سرِ کشمکش رہتے۔ اس طرح قبیلوی عصبیت نے علاقائی عصبیت کی راہ اختیار کر لی[2]۔ بعد کی ساری تاریخ میں اس بلا نے مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ بے شمار فتنوں اور بغاوتوں کا باعث بھی بلا بنتی رہی۔ پھر عصبیتوں کا ایک طوفانِ عظیم وہ تھا جو عربوں اور دوسری قوموں کے درمیان پیدا ہوا۔ بنو امیہ کے دور میں عربوں کے تفوق نے فارسیوں میں سخت قسم کی جوابی عصبیت پیدا کر دی۔ عباسی دور آیا تو فارسیوں کے عروج میں عربوں کے جذبات کھولتے رہے۔ فارسیوں کا زور توڑنے کے لیے جب ترکوں کو لایا گیا تو فارسیوں اور ترکوں کی باہمی رقابت کا چکر چلا اور اس کی وجہ سے بارہا سازشیں اور خونریزیاں ہوئیں۔

---

[1] فجر الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ص ۱۸۰۔

[2] ایضاً ص ۱۸۱

دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ملت کا وہ عالم فکر و اخلاق جو نو تعمیر شدہ تھا، درہم برہم ہوگیا۔ اہل فارس اسلامی معاشرہ میں آئے تو اپنے ساتھ زردشت اور مانی، مزدک اور بزرجمہر کی تعلیمات اور تاریخی حکایات کو بطور سرمایۂ افتخار لے کے آئے، اس کے ساتھ ایرانی ادب اور موسیقی لائے۔ اسی طرح ترک آئے تو رومی اثرات کا ریلا ان کے ساتھ آیا، پھر یونانی حکمت کے دفتر اسلامی معاشرہ تک پہنچے، اسی طرح ہندوستان سے ویدانت کا فلسفہ اور دوسرے علوم کے ابواب منتقل ہوئے، پھر یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں نے اپنے اپنے عقاید و حکایات کے دفتر کھول دیئے۔ اس فکری اختلاط نے ذہنوں کے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔ مناظروں اور بحثوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور طرح طرح کے فتنے انگڑائیاں لینے لگے۔ مثلاً شیعہ سنی فسادات کثرت سے ہونے لگے[1] مراۃ الجنان میں ایک بڑے شیعہ سنی فساد کا تذکرہ ملتا ہے جو حران (جس شہر سے امام ابن تیمیہ کو نسبت ہے)، میں واقع ہوا (۳۷۶ھ) اسی تصادم افکار نے فتنۂ خلق قرآن کو ابھارا[2] بڑے شہروں میں اعتقادی اور کلامی بحثوں کے دنگل قائم ہوگئے۔ ایسا ہی ایک دنگل بصرہ میں ہوا کرتا تھا جس سے حضرت امام ابو حنیفہ نے بھی دورِ اوائل میں دلچسپی لی۔ مناقب موفق میں ہے کہ وہاں جا جا کر خارجی فرقوں سے بحثیں کرنے مگر تجربے کے بعد ان کا دل بصرہ کے بحث پسندوں سے کھٹا ہوگیا۔ فرماتے ہیں:

> "میں دیکھتا ہوں کہ ان کے قلب بے حس ہیں، ان لوگوں کو کتاب و سنت کے خلاف بات کہنے میں ذرا باک نہیں"[3]

تیسرا اثر یہ ہوا کہ اسلام کی پابند اخلاق ثقافت کی جس تباہی کا آغاز بنو امیہ کے دور میں ہوا تھا اس کی تکمیل عباسی دور میں اسی اختلاطِ عناصر کی وجہ سے ہوئی۔ دین کی بالادستی کا ختم ہو کر اس کا ایک محدود مذہب کی حیثیت اختیار کر جانا خود ہی کچھ کم حادثہ نہ تھا، اس کے

---

[1] ابن تیمیہ ۔ از مولانا محمد یوسف کوکن پوری ص ۷۰،۴ [2] المامون ۔ از شبلی نعمانی ص ۲۱۰ تا ۲۱۲

[3] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ ص ۱۳

ساتھ ساتھ شاہی خاندان میں عزت نسب، علو حسب جن روایات کے ساتھ قائم تھا وہ بھی اختلاطِ عام کی وجہ سے کمزور پڑ گئیں۔ دیس دیس اور بھانت بھانت کی لونڈیوں کا محلوں میں بھر جانا، پھر شاہی خاندانوں کی اولادوں کی ناقابلِ انضباط کثرت ــــ (مامون کے دور میں یہ تعداد ۳۳ ہزار تھی)، چنانچہ علامہ شبلی جب مامون کو عقاید کے لحاظ سے "معجون مرکب" قرار دیتے ہیں تو اس کا سبب مختلف زبانوں کی تعلیم و معاشرہ کو قرار دیتے ہیں[1] ان حالات میں اسلامی معاشرہ اپنی مخصوص ثقافت پر کیا جما رہ سکتا۔ انتشار ناگزیر تھا۔ ثقافتی انتشار کے عالم میں جہاں مئے و مغاں اور شراب و رباب کا دور دورہ ہوا وہاں یہ بھی ہوا کہ مامون نے ایک بار متعہ کی حلت کا فرمان جاری کر دیا جسے قاضی یحییٰ بن اکثم نے جان پر کھیل کر رکوایا[2]۔ اسی طرح معتضد باللہ کے دور میں (۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ) متعہ، نبیذ، موسیقی اور دوسرے تمام ممنوعات کو حلال کرنے کے لیے ایک کتاب مرتب کر کے خلیفہ کے ہاتھ میں دی گئی۔ حکومت پرست تاویل بازوں کے اس کارنامہ کے خلاف وقت کے قاضی نے دربار میں پورے استدلال سے بات کی یہاں تک کہ کتاب جلوا دی گئی[3]

اس اختلاطِ عناصر کے مفاسد کا ازالہ جبھی ہو سکتا تھا کہ اقتدار خود اسلامی فکر و ثقافت پر ثابت قدم ہوتا اور عوام الناس کو اس پر قائم رکھنے کے لیے نہایت مضبوط اور وسیع تعلیمی نظام جاری کرتا۔ لیکن شاہی دربار کا سفینہ تو خود بغیر کسی بادبان اور لنگر کے فتنوں کے سیلاب میں بہا جا رہا تھا وہ معاشرہ کو کیا بچاتا۔

خورج کی سیاسی مداخلت کسی بھی حکومت میں دیکھنے کی بڑی اہم چیز یہ ہوتی ہے کہ مرکز قوت کہاں واقع ہے جس کی پشتیبانی سے حکمراں کی مسند قائم رہتی ہے۔ صحت مند معاشروں میں یہ مرکز جمہور کے درمیان ہوتا ہے اور رائے عام سلطنت کو تھامتی ہے۔ لیکن مستبد اور

---

[1] المامون ــ از علامہ شبلی نعمانی ص ۲۰۸ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۹۹، ۲۰۰

[3] تاریخ الخلفاء ص ۳۷۹

مطلق العنان اقتدار کا حقیقی سہارا فوج ہوتی ہے کیونکہ اسے نظریہ اور دلیل کے بجائے تلوار کے زور سے فرماں روائی کرنی ہوتی ہے۔ جہاں مرکز قوت فوج کے اندر ہو وہاں فوج سیاست زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ عباسی حکومت کی بیماریوں میں سے بہت بڑا روگ یہ تھا کہ اس کی رگ جاں فوج کے پنجہ میں تھی۔

عباسی حکومت کا قیام و بقا چونکہ ایرانی سپاہیوں پر منحصر تھا اور آئے دن کی جنگوں اور بغاوتوں میں ان کی خدمات درکار ہوتی تھیں اس لیے وہ سلطنت پر حاوی رہے ادھر وزارت کی کرسی پر بیٹھ کر ایرانیوں نے سیاسی اثر کا سکّہ خوب چلایا خصوصًا برامکہ کے دور وزارت میں ایرانی اثر و نفوذ درجہ کمال پر تھا۔ ایک ایرانی النسل وزیر کے ہاتھوں آل ساسان کی طرز کا نظام حکومت رائج ہو گیا[1]۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خلیفہ کے بعد ولیعہد کی بیعت کرنے یا ولیعہد کی عدم موجودگی یا اس کے بالغ ہونے کی صورت میں خلیفہ کو نامزد کرنے کے لیے جب بھی عمائدین سلطنت کی مجلس بیٹھتی ہے تو لازمًا فوج کے افسر اس کا ایک اہم عنصر ہوتے ہیں۔

ایرانی تسلط نے حد سے بڑھ کر جب خلیفہ کو بے بس کرنا شروع کیا تو توازن کے لیے ترکوں کو لایا گیا۔ سب سے پہلے خلیفہ معتصم نے اپنی ترکی والدہ کے اثر سے ترکوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ ہزاروں ترکی غلام خریدے اور ان کے لیے دیبا کی وردیاں اور جواہرات سے مرصع سنہری ٹپکے بنوائے[2]۔ اسی طرح واثق باللہ نے ایک ترکی سردار کو نائب السلطنت مقرر کیا اور اسے اپنے ہاتھوں سے تاج پہنایا[3]۔ بجائے اس کے کہ عباسی خلفاء کسی مرحلے پر جمہور کی طاقت کی طرف متوجہ ہوتے اور رائے عام کو اپنے گرد منظم کرتے انہوں نے ایک زہر کا علاج ویسے ہی دوسرے زہر سے کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلفاء کی طاقت ترکوں کے ہاتھ میں

---

[1] HAROON ALRASHID - BY PALMER. P37-38

[2] تاریخ الخلفاء ص ۲۲۲ [3] ایضًا ۳۴۸

چلی گئی۔ فوج کا نشہ قوت اتنا بڑھا کہ سپاہی کھلے بندوں قانون کو پامال کرتے، لوگوں کو گھوڑوں تلے روندتے، مال لوٹ لے جاتے، عورتوں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے مگر حکومت آڑے نہ آسکتی[1] خلیفہ معتز کی تخت نشینی پر نجومیوں سے پوچھا گیا کہ خلیفہ اور اس کی سلطنت کی عمر کیا ہوگی؟ ایک مسخرہ بول اٹھا کہ "یہ ترکوں سے پوچھیے"[2] چنانچہ یہ خلیفہ ترکوں اور دوسرے عناصر کی مشترکہ بغاوت کا نشانہ بن کر دردناک موت مرا[3]۔ مستعین باللہ (۲۴۸ھ تا ۲۵۱ھ) کو ترکوں نے معزول کر کے نظر بند کر دیا اور بعد میں قتل کر ڈالا۔ اسی طرح مہدی بن واثق (۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ) کو معزولی، قید اور ظلم کے مراحل سے گذار کر قتل کیا گیا۔ معتضد باللہ کے زمانے میں خلیفہ کا تقرر اور عزل فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں تھا اور یہ بھی بغاوت میں مارا گیا[4] (۳۲۰ھ) قاہر باللہ (۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ) کو بھی فوج کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور سپہ سالار مونس نے وزیر اعظم سے مل کر اسے معزول کر دیا[5] پھر آگے چل کر عباسیوں نے آل بویہ کی اور ان کے بعد سلجوقیوں کی مدد سے اس بلا سے نجات پانا چاہی مگر جس سے مدد لی وہی گردن پر سوار ہو گیا اور پہلوں سے بدتر ثابت ہوا۔ اسی فوجی اثر کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے نئے عہدے قائم کیے جاتے رہے، مثلاً دورِ عہد راضی باللہ ایک نیا عہدہ امیر الامراء قائم کیا گیا لیکن خود امیر الامراء خلیفہ پر چھا جانے لگے[6] پھر فوج کی سیاست زدگی اور بادشاہ گری کی وجہ سے تمام نظم و نسق کی رگوں میں سازشوں کا زہر سرایت کر گیا اور بار بار بغاوتیں اور تصادم ہوتے (۵۰۰ سال میں ایسے واقعات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سر چکرا جاتا ہے) اور ہر با اثر شخصیت اور عنصر دوسروں کے خلاف مصروف تگ و تاز رہتا

فوج کے انہی حالات کو دیکھ کر ابن المقفع نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ان کے

---

[1] تاریخ طبری ج ، ص . . . [2] الفخری ص ۲۲۱ [3] ابن الاثیر ج ، ص ۶۹، ۶۹

[4] تاریخ الخلفاء ص ۲۵۵ [5] الفخری ص ۲۴۶

[6] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۰

لیے دستور اور کوئی ضابطہ ہونا چاہیے اور وہ تدبیریں بتائیں تھیں جن سے فوج کی سیاسی بالادستی کو روکا جاسکتا تھا۔[1]

نظم و نسق کی تباہی | عباسیوں نے تمدنِ عالم میں یہ اضافہ تو ضرور کیا کہ مطلق العنان فرماں روائی کے لیے ہیئتِ سیاسیہ کو بڑی نشو و نما دی، نئے نئے عہدے ایجاد کیے، مختلف شعبہ ہائے حکومت بنائے، کئی قسم کے دفاتر قائم کیے اور ان کے سیاسی تجربات نے بہت سا نیا سرمایہ تاریخ کے دامن میں ڈالا۔

مگر اوپر جو حالات ہم نے بیان کیے ہیں — یعنی مطلق العنان اقتدار، جمہور کے بجائے محدود طبقے کی بالادستی، فوج کی سیاسی مداخلت، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، قومی مالیات کا صرفِ بے جا، اور رندانہ ثقافت کا زور شور، نت نئی بغاوتوں اور سازشوں کے ریلے — ان چیزوں نے نظم و نسق کو گھن لگا دیا۔

اس سلسلے میں ہم ایک بار پھر ابن المقفع کے رسالۃ الصحابہ (جس میں خلیفہ کے درباریوں پر تبصرہ کیا گیا ہے) کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس نے وقت کے شاہد کی حیثیت سے حالات کی تصویر بعد والوں کے لیے مرتب کردی ہے۔ وہ عمائدِ سلطنت کو بدترین حرکات کا مرتکب قرار دیتا ہے جو حسب نسب اور سیاست کے لیے غارت گر ہیں۔ یہ اشرار کو مقرب بناتے ہیں اور اخیار کو دُور ہٹاتے ہیں۔ اس کے رسالہ کی عبارتیں بتاتی ہیں کہ رشوت اور سفارش کا دَور دورہ تھا اور اعیان اور افسران اور ملازمین اپنے حدودِ اختیار سے تجاوز کرکے دوسرے شعبوں میں مداخلت کرتے تھے۔[2] پھر ابن المقفع نے نسخۂ شفا یہ تجویز کیا ہے کہ:

"عام لوگ اس وقت تک اصلاح پذیر نہیں ہوتے کہ خواص سیدھے راستے پر نہ پڑیں اور خواص کی درستی نہیں ہوتی جب تک کہ ان کا سربراہ راست رو نہ ہو۔"

---

[1] ضحی الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ج ۱ ص ۲۱۵ [2] ایضاً ص ۲۲۲

اختیار نہ کرے ۔ پس جب خواص دین و عقل سے آراستہ ہوں تو پھر عوام کی
اصلاح ہو سکتی ہے[1]

کسی حکومت کا سب سے محترم شعبہ قضا کا شعبہ ہوتا ہے اور پھر اسلام میں تو قاضی خدا و رسول کے قانونِ عدل کا امانت دار بن کر بیٹھتا ہے ۔ لیکن امویوں کی ڈالی ہوئی طرح کے مطابق قضا کا شعبہ بھی حکومت کی مداخلت بے جا سے مجروح ہوتا رہا ۔ واقعہ ہے تو اموی دور کا ، لیکن دیکھئے کہ قضا کا مقدس عہدہ حکومت خود رشوت یا انعام کے طور پر دیتی ہے ۔ مروان نے ایک بار قاضی عابس بن سعید سے بات کی تو معلوم ہوا کہ کتاب ، سنت اور فرائض کے علم سے کورے ہیں ۔ پوچھنے پر ان کے تقرر کا حال معلوم ہوا ۔ قصہ یہ تھا کہ یزید کی بیعت سے جب عبداللہ بن عمرو بن العاص نے انکار کیا ۔ تو امیر معاویہ نے سلمہ والیٔ مصر کو لکھا کہ عبداللہ کو درست کرنے کے لئے کون آمادہ ہے ۔ عابس بن سعید نے اپنی خدمات پیش کیں اور پولیس کی گارد ساتھ لے کر ان کے گھر کا محاصرہ کر کے آگ لگانے کی تیاری کی ۔ چاروناچار عبداللہ بن عمرو نے بیعت کے الفاظ ادا کر کے مخلصی حاصل کی اس پر عابس کو قضا کا منصب ارزانی ہوا[2]

قاضی عبداللہ کے سامنے ایک تاجر اور فوجی جنرل کا مقدمہ آیا ۔ خلیفہ مہدی نے بصیغۂ راز حکم بھیجا کہ فیصلہ جنرل کے حق میں کیا جاتا ہے ۔ قاضی نے فیصلہ حق کے مطابق جنرل کے خلاف کر دیا ۔ اس پر قاضی صاحب معزول کر دیئے گئے[3] قاضی حفص بن غیاث نے ملکہ زبیدہ کے چہیتے مرزبان کے خلاف ڈگری دے دی تو ملکہ ہارون کے سر ہو گئی کہ اس قاضی کو معزول کر دیا جائے ۔ آخر ہارون .... نے قاضی حفص کا تبادلہ کوفہ میں کر کے جان چھڑائی ۔

---

[1] ضحیٰ الاسلام از ڈاکٹر احمد امین مصری ۔ ج ۱ ص ۲۲۴ [2] ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۲۶ بحوالہ حسن المحاضرہ ۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰۹

قضا تو کیا، وزیر اعظم تک اس خرابیٔ احوال (Corruption) کا شکار ہو جاتا ہے
علی بن عیسیٰ نے حالات کی اصلاح کی مہم شروع کی تو مالیات کا انضباط بھی کیا۔ والدہ خلیفہ مقتدر کی ایک مصاحبہ نے عید الاضحیٰ پر رقم طلب کی تو وزیر اعظم نے معذرت کر دی۔ اس مصاحبہ کی ناراضی کی وجہ سے وزیر اعظم کو برطرف کر دیا گیا۔[1]

اپنے سیاسی مصالح کے لیے خود خلیفہ رشوت دیتا ہے۔ فتنہ خلقِ قرآن کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے جو شاہی فرامین اسحٰق بن ابراہیم نائب بغداد کو بھیجے گئے تھے ان میں سے ایک میں خلقِ قرآن کا قائل بنانے کے لیے مختلف افراد کے لیے مختلف ترکیبیں لکھی گئی ہیں۔ اسی سلسلے میں فضل بن غنم کے متعلق خلیفہ خود لکھواتا ہے کہ اس نے مصر میں اپنے لیے جو جو کچھ بنایا ہے اور قلیل مدت میں جو اموال سمیٹے ہیں ان کے متعلق باز پرس نہ کی جائے گی۔ خط کا ایک فقرہ یہ ہے کہ چونکہ اس شخص کو درہم و دینار کا لالچ بے حد ہے۔ فلیس بمستنکر ان یبیع ایمانہ طمعا فیھما۔ یعنی خلیفہ جانتا ہے کہ معاملہ ایک شخص کا ایمان خریدنے کا ہے۔[2]

نیچے کیسے رشوت نہ پھیلتی۔ قاضی عافیہ کو ایک مقدمہ میں رشوت دینے کی کوشش کی گئی۔ وہ کاغذات لے کر دربار پہنچے اور درخواست کی کہ مجھے فارغ کر دیا جائے کیونکہ میری متاعِ ایمان خطرے میں ہے۔ اسی طرح مدینہ میں کچھ باغی ربنی ہلال اور بنی سلیم کے آدمی محبوس کیے گئے۔ انہوں نے فرار کے لیے پہرہ داروں کو ۵ ہزار دینار کی رشوت دی مگر اتفاق سے فرار کا منصوبہ ناکام رہا۔[3]

غالباً رشوت کی آمدنی کی وجہ سے عدالتی مناصب کی قیمت چڑھی اور بڑی بڑی رشوتیں ان کے حصول کے لیے دی جانے لگیں۔ ابو العباس عبداللہ بن شوارب نے معز الدولہ سے

---

[1] ابن اثیر ج ۸ ص ۲۶ [2] طبری۔ ج ۷ ص ۲۰۳

[3] طبری ج ۷ ص ۲۲۵

قضا کا منصب ۲ لاکھ درہم سالانہ کے بدلہ میں حاصل کیا اور اس کا باضابطہ قبالہ لکھ کر اسے دے دیا۔[1] اسی طرح بروایت ابن الطقطقی ابن مقلہ نے ۵ لاکھ دینار رشوت میں راضی باللہ سے وزارت کا عہدہ حاصل کیا۔[2] ابن جبیر نے قائم بامر اللہ سے ۳۰ ہزار دینار پر وزارت خریدی۔[3]

گورنری کا منصب بھی رشوت کے عوض بکنے لگا۔ چنانچہ یحییٰ بن خاکان نے (دورِ مقتدر میں) کوفہ کے لیے ایک ہی دن ۱۹ آدمیوں کو گورنری کے تقرر کے پروانے دے دیئے اور سب سے رشوت وصول کی۔ اتفاقاً راستے میں یہ سارے گورنر جمع ہو گئے تو ان کو معلوم ہوا۔[4] ایک شاعر نے اس رشوت خوار وزیر کی ہجو میں شعر کہے جن کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ ایسا وزیر ہے جو رقعہ لکھنے سے اکتاتا نہیں۔ ایک شخص کو والی بناتا ہے پھر ایک ساعت بعد اسے معزول کر کے دوسرے کو مقرر کر دیتا ہے۔ جس سے رشوت پہلے وصول ہو جاتے اس کو مقرب بنا لیا ہے" وغیرہ۔

نظم و نسق میں عدم استحکام کا حال ایک موقع پر یہاں تک پہنچا کہ مقتدر کے دور میں یکے بعد دیگرے ۱۲ وزیر مقرر ہوئے۔

قدرتی امر تھا کہ ایسے حال میں جرائم کا زور ہو جاتے۔ چنانچہ شہری مجرموں کو تو چھوڑ دیئے خود فوجی ملازمین نے بغداد میں لوٹ مار مچادی (۲۰۱ھ، ۲۰۲ھ) لوگوں کو مارتے پیٹتے، جبراً رقمیں وصول کرتے، دکانوں سے مال اٹھائے جاتے۔ آخر تنگ آکر شہری خود اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے حفاظت خود اختیاری کے اصول کے تحت مجرمین کے مقابلے کی ٹھانی۔ دو تنظیمیں بن گئیں۔ ایک خالدین درویش کے تحت جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام آئینی حدود میں کرنے کے لیے اٹھی، دوسری سہل بن سلامہ انصاری کے تحت جس کا مقصد تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی تھا مگر طریق کار زیادہ جابرانہ تھا۔ یعنی جو بھی بدراہ ہو اسے

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۵، ۲۶۶ [2] الفخری ص ۲۰۷ [3] ایضاً ص ۲۱۴

[4] الفخری ص ۲۴۰، ۲۴۱ [5] طبری ج ۷، ص ۱۸۸

قوت سے ٹھیک کیا جائے خواہ وہ سلطان ہو یا کوئی اور[1]۔

مجرمین کی دیدہ دلیری کا حال یہ تھا کہ ایک بار چوروں نے دار العامہ میں گھس کر بیت المال میں نقب لگائی اور بڑی آسانی سے ۲۴ ہزار درہم اور کچھ دینار لے بھاگے۔ معاملہ چونکہ سرکاری تھا اس لیے بعد میں پکڑے گئے[2]۔

عباسی دور ہی میں ابو الہیثم جیسی تاریخی شخصیت بھی تھی جس نے حضرت امام احمد بن حنبل کو تلقین استقامت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو میں چوری کرتا ہوں، مجھے بار بار پکڑا گیا اور میری پیٹھ پر ۱۸ ہزار تازیانے پڑے ہیں مگر میں آج تک باز نہیں آیا، آپ تو اللہ کی راہ میں اٹھے ہیں[3]۔

علم و حکمت کا فروغ ملتِ اسلامیہ کی اساس اعتقاد اور علمِ حقیقت پر رکھی گئی تھی اور تعقل و استدلال اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ قرآن ذوقِ علم کو مہمیز کرتا ہے اور حدیث اسے جلا دیتی ہے۔ ایسی ملت فتوحاتِ علمی کی مہم میں کبھی کوتاہی نہیں دکھا سکتی۔ چنانچہ دورِ نبوت ہی میں مسلمانوں کے اندر غیر زبانوں کے جاننے والے سیکرٹری اور ترجمان پیدا ہو گئے، تورات کے مطالعہ کی طرف بھی توجہ ہو چکی تھی، پھر خلافتِ راشدہ میں سیاسی ضرورت سے مختلف علاقوں کے مذہبی و سماجی احوال کی رپورٹیں حاصل کی جانے لگیں۔ اور اس کے بعد بنو امیہ کے دور میں فارس اور روم کے علم و ادب کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ یہی رو عباسی دور میں تیز تر ہو گئی۔ مامون کا دور علمی ترقی کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہے۔

عباسی خلافت کے دور زریں میں تین قسم کے علوم پر توجہ دی گئی: ایک فلسفہ و ادب کے تراجم، دوسرے فنی، ٹیکنیکل اور تجرباتی علوم، جیسے طب، مساحت، ہیئت، ریاضی، سائنس وغیرہ۔ تیسرے غیر مذاہب کی معلومات۔

ان علوم کی طرف توجہ کا ایک سبب یہ تھا کہ اقوامِ غیر کے نو مسلم اور غیر مسلم عناصر

---

[1] طبری ج ۱۰ ص ۴۸ - ۲۴۱ [2] طبری۔ حالات ۲۳۱ھ [3] ائمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری ص ۶۱۶

مسلمانوں کے سامنے ایسی باتیں کرتے جو ان کے لیے نئی تھیں اور وہ لوگ ان کو فخر کے ساتھ پیش کرتے کہ ہمارے پاس ایسے علوم ہیں جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنے اسلوب پر بحثیں چھیڑتے تو مسلمان ان کے ساتھ نہ دبے سکتے۔ سو غیر اقوام کے علوم کو حاصل کرنے کا شوق امڈ پڑا۔ مامون نے دار الحکمت قائم کیا تو اس کا بڑا شعبہ دار الترجمہ تھا۔ اس ادارے کے تحت متواتر ۱۰۰ برس تک ترجمہ کا کام ہوتا رہا[1]۔ مترجمین کو بڑے بڑے معاوضے دیئے جاتے اور پھر ہر ترجمہ شدہ کتاب کے عوض سونا یا چاندی تول کر دیا جاتا تھا[2]۔ حکیم لیو یونانی کی خدمات حاصل کرنے کے لیے مامون نے شاہ یونان کو ۵ من سونا دینا منظور کیا تھا[3]۔

علم بڑی نعمت ہے خواہ جہاں سے ملے۔ حضورؐ نے حکمت کو مسلمان کی اپنی ہی گم گشتہ دولت قرار دیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کی تلقین بھی کی ہے مگر ترقی علم کی عباسی تحریک کی ایک اساسی کمزوری سخت ضرر رساں ثابت ہوئی۔ یعنی بیرونی علوم کو مرعوبانہ ذہن کے ساتھ لیا گیا۔ جہاں اغیار کا سیاسی نفوذ کارفرما تھا، جہاں ان کی ثقافت خواہشات کی مسجود بن رہی تھی وہاں ان کے علوم کے لیے مرعوبیت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ اپنی بنیادوں سے متزلزل ہوتے ہوئے کسی معاشرہ پر اگر باہر سے فکری حملہ ہو جاتے تو پھر اس کا تمام عالم افکار زیر و زبر ہو جاتا ہے۔ یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ معاشرہ کی قیادت تنقیدی زاویۂ نگاہ سے محروم تھی۔ بیرونی علوم کے لیے قرآن کو حکم اور دین کو کسوٹی بنانے کے بجائے الٹا عقلی فہم دین کو بیرونی طرز فکر کے سانچے میں ڈھالنے کی شروع ہو گئی۔ اقبال کے الفاظ کے مطابق وہاں اپنی خودی میں آشیانہ برقرار نہیں رہا تھا۔

---

[1] اسلام اور عرب (انگریزی سے ترجمہ) از فلپ۔ کے۔ حتی ص ۱۱۲

[2] المامون از علامہ شبلیؒ ص ۱۶۵ [3] ایضاً ص ۱۷۰

معاشرہ میں مرعوبانہ ذہنیت پیدا کر کے اور اسے اپنے سرچشمۂ فکر سے کسی قدر غافل رکھ کر آزادئ خیال کی فضا پیدا کر دیجیے، پھر کوئی اساسی اعتقاد بھی صحیح سالم نہ رہ جائیگا۔ عباسی حکومت جو سیاسی پہلو سے تو کسی کو آزادئ خیال کی ہوا بھی لگنے دینے کی روادار نہ تھی۔ اس نے اعتقادات اور اخلاقیات کے معاملے میں آزاد خیالی کا کھلا میدان نوجوانوں کو فراہم کر دیا۔ خود دربار کی طرف سے ایک مجلس مناظرہ لگتی جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ جمع ہوتے، ہر سہ شنبہ کو یوم مناظرہ ہوتا اور خود مامون اس میں حصہ لیتا[1] مناظروں کا یہ ذوق بغداد اور دوسرے تمام شہروں میں عام ہو گیا اور گھر گھر بحثیں ہونے لگیں۔ ایرانی اور یونانی فلسفوں کے نشتر سے کے اسلام کے ایک ایک عقیدہ کی جراحی کر ڈالی گئی۔ یہ اس قوم کا حال تھا جو دنیا کو اسلامی نظام کا درس دینے کے لیے مامور ہوئی تھی۔ اس فکری ابتری کے ساتھ اخلاقی تباہی کا ورود لازم تھا اور وہ ہوا۔ اسی آزادئ خیال کی فضا میں فتنۂ خلقِ قرآن ابھرا اور آزادئ خیال کا عنان بردار خلیفہ خود ہی اتنا تنگ خیال ثابت ہوا کہ اس کے اختیار کردہ عقیدۂ فاسدہ سے اختلاف کرنے والوں کی جان پر بن گئی۔ ایک صاحبِ نظر کا تبصرہ اس علمی ترقی کے متعلق ملاحظہ ہو:۔

> "اس میں شبہ نہیں کہ یہ علوم و فنون کی ترقی اور شعر و ادب کی گرم بازاری مسلمانوں میں بڑی حد تک دماغی بلند پروازی اور ذہنی ثقافت کے عروج کے پیدا ہو جانے کا باعث ہوئی لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اسلامی عقائد کی سادگی اور راسخ العقیدگی کو صدمۂ عظیم پہنچا اور یونانی علوم و فنون کی گرم بازاری نے خالص اسلامی افکار کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلمان عقیدہ و خیال کی وحدت سے کٹ کر ایک نہایت خطرناک قسم کی دماغی لاادریت میں مبتلا ہو گئے"[2]

---

[1] المامون از علامہ شبلی ص ۱۸۰ ، [2] مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا سعید احمد ایم اے ص ۹۰

قابلِ قدر اشخاص اور کارنامے

ہم نے عباسی دور کا جو نہایت اجمالی سا جائزہ لیا ہے اس کے پیچھے کوئی تعصب اور بے انصافی کام نہیں کر رہی اور ہم اچھے اشخاص کے اچھے کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے سامنے عباسیوں کی بعض گراں بہا فتوحات ہی نہیں ہیں، ان کے ایسے روشن اقدامات بھی ہیں جن میں اسلامی روح جھلکتی ہے۔ پھر جن خلفاء، سلاطین یا وزراء نے حالات کو رو بہ اصلاح کرنے کے لیے مساعی کی ہیں ان کو ہمارا خراجِ تحسین پہنچنا چاہیے مثلاً خلیفہ منصور نے قصرِ شاہی اور سرکاری امور میں اسراف کو ختم کرنے کی موثر کوششیں کیں۔ نیز قافلۂ لہو و لعب کا گذر اس کے ہاں کبھی نہ ہوا[1]۔ مہدی جس نے تخت نشینی کے پہلے ہی دن باپ کی وصیت کے مطابق تمام قیدی رہا کر دیئے تھے اور ضبط شدہ جائدادیں واگذار کر دی تھیں، اپنے غرور، سخت گیری اور عیش پسندی کے باوجود مظلوموں کی دادرسی کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا[2]۔ ہارون کا یہ کام کتنا بڑا ہے کہ اس نے امام ابو یوسف کے ہاتھوں قانونِ شریعت کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ معتصم کا معاملہ دیکھیے کہ ایک مسلمہ رومیوں کی قید میں "وا معتصماہ" پکارتی ہے اور معتصم کو جونہی اطلاع ملتی ہے "وہ میں پہنچا" کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ فوجوں کی تیاری شروع ہو جاتی ہے اور وہ حملہ کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بوشجاع وزیر کو دیکھیے کہ اس کے دور میں خلیفہ نے شیعہ سنی فساد کے سلسلے میں دس ممتاز اصحاب کے گھروں کو ڈھا دینے کا حکم دیا تو اس نے ان گھروں کی قیمت گرہ سے ادا کی[3]۔ پھر مہتدی باللہ بن واثق (۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ) کو دیکھیے جس کے ذہن پر یہ احساس طاری تھا کہ بنو عباس میں ایک شخص بھی عمر بن عبدالعزیز جیسا نہ نکلا۔ اس نے اسراف و تنعم کا خاتمہ کر دیا۔ ایوان کے مرقعوں کا صفایا کر دیا، پالتو درندوں، مینڈھوں اور مرغوں کو ذبح کرا دیا، دسترخوان کا خرچ ۱۰۰ درہم روزانہ تک کم کر دیا، روکھی سوکھی روٹی کھاتا اور اس کے باوجود بغاوت کا نشانہ بن کر جاں بحق ہوا[4]۔

---

[1] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ ۳ ج ۱ ص ۶۵، ۶۶ [2] الفخری ص ۱۶۱

[3] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر علی ابراہیم حسن ص ۱۶۵، ۱۶۶ [4] مسعودی ج ۸ ص ۹

پھر ناصر باللہ نے اپنی شانِ رندی کے باوجود فضا کو درست کرنے کے لیے خاص کوشش کی؛ رقص و غنا کے پیشے بند کرائے اور شراب کی ممانعت کی[1]۔ طائع باللہ اور قادر باللہ نے نہایت اچھے اچھے کام کیے۔ مقتدی بامر اللہ نے زنا، جوئے اور شراب کا انسداد کیا[2]۔ پھر کتنوں ہی نے علمی خدمات ہیں۔ کتنوں نے بعض ضرورت مندوں، مقروضوں اور اہلِ علم کو عطایا دیے۔ ایک بار ہارون نے ایک درویش منش عالم کے ہاتھ خود دھلوائے۔ کیا کیا واقعات گنوائے جائیں اور پھر اس سے کیا انکار کہ عباسی خلفا آگے چل کر اگرچہ سیاسی لحاظ سے بے اختیار ہو کر ابن ابی اشرف کے اس شعر کے مصداق ہو گئے تھے کہ:

القاب مملکۃ فی غیر موضعہا کالھر یحکی انتفاخاً صورۃ الاسد

(ان لوگوں پر سلطنت کے القاب کا استعمال بے محل ہے۔ ان کی مثال ایسی بلی کی سی جو پھول کر شیر کی نقل اتارتی ہے)

مگر دوسری طرف یہ لوگ ظاہری مذہب داری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اس لیے اسلام کے سرپرستوں کی حیثیت سے دیکھے جاتے تھے۔ یوں کہیے کہ کم سے کم وہ علامتی حیثیت سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ تھے اسی وجہ سے سیاسی اثر کھو دینے پر بھی ان کا روحانی اثر باقی رہتا ہے[3]۔

مگر ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اجتماعی زندگی کی گاڑی کدھر جا رہی تھی۔ بہ حیثیت سوانح نگار تو کسی شخص کو ان میں سے ہر آدمی کی خوبیوں اور جزئی واقعات کو بھی سامنے لانا چاہیے مگر تاریخ کے طالب علم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ نظام کیا تھا۔ اور پھر بہ حیثیت مسلم اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ قافلہ احوال اسلام کی قیادت میں چلا یا انحراف کر گیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ہر قدم کو ترقی کہہ کر اپنا فرض ادا نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ترقی اسلام کے مطابق؟ یا اسلام سے آزاد ہو کر؟ یا اسلام کو پامال کر کے؟ (دیکھیے)

[1] تاریخ [illegible] ص ۳۰۰، ۳۰۴ [2] ابن [illegible] ص ۳۰۴ [3] مقدمہ [illegible] [illegible]

جمہوریت کی کہانی

نعیم صدیقی

(۲)

یونان میں سیاسی حکمت کا نشو و نما یونان میں ایسے حالات بہم ہو گئے تھے کہ انسانی فکر نے انگڑائی لی، اس نے گرد و پیش پر بھی اور اپنے اوپر بھی نگاہ ڈالی، پھر وہ اٹھی، حرکت میں آئی اور جستجوئے حقیقت کی راہ پر اُس نے اقدام شروع کر دیا۔ بادۂ تجسس سے سرشار ہو کر ایک بار جب بحث پے سپر ہو گئی تو مختلف علوم کے دروازے کھلتے گئے۔ فلسفہ، طب، فلکیات، ریاضی، اقلیدس، اخلاق، ادب اور سیاست کے ہر دائرے میں اس مخصوص دورِ تاریخ کے لحاظ سے دیکھیں تو حیرت انگیز کام ہوا۔ علم السیاست کے میدان میں بھی یونان نے بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ جدید یورپ جس نے اپنا تہذیبی نسب یونان سے جوڑا، اس کے پورے موجودہ تمدن کی جڑیں یونانی حکمت سے مربوط ہیں ــــ اور اس کی تابناکیوں یا تاریکیوں دونوں کا فکری رشتہ یونان سے ملتا ہے۔ تمدنِ حاضر کے دو بڑے پہلو ــ عقلیت اور شہوانیت ــ پوری طرح یونان سے لیے گئے ہیں۔ جدید جمہوریت بھی جس کے ادارات عظیم تر اور جس کے مسائل وسیع تر اور جس کا فکری سرمایہ وقیع تر ہے، یونان کی سیاسی حکمت سے گہرا رشتہ رکھتی ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے افکار جہاں دوسرے مختلف علوم کی ترقی کے محرک بنے ہیں، وہاں انہی سے قرونِ وسطیٰ کے اروپائی انسان کو وہ سیاسی سوالات اور مباحث کے وہ بیج ہاتھ آئے ہیں جن سے عصرِ حاضر کے سیاسی فلسفوں اور نظریات کی فصل اٹھی ہے۔ اسی لیے ہمیں یہاں یونان کی سیاسی حکمت کا جائزہ لینا ہے۔

اگرچہ کسی بھی گذشتہ تمدن کے عالمِ افکار کا صحیح جائزہ لینا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ

اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس ماحول میں کدھر سے کیا اثرات ایک قوم پر آکر پڑے۔ پھر سیاسی فکر کا مطالعہ کرنے کے لیے فلسفہ کی دوسری شاخوں اور مذہب و اخلاق کے ہم عصر نظریوں کو دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مگر اس طرح کا تحقیقی مطالعہ کرنے چلیں تو یونان، اس کا تمدن، اس کا فلسفہ اور اس کا علم السیاست ایسے موضوعات ہیں کہ جن پر لکھنے والوں نے ضخیم مجلدات کے انبار لگا دیئے ہیں اور ابھی کام جاری ہے۔ ہمارے لیے اجمال کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

تمہید کے طور پر ہم یہی بیان کر سکتے ہیں کہ قبائلی دور کے ذوقِ آزادی کے ساتھ جب یونانیوں کو چھوٹی چھوٹی شہری آبادیوں میں رہ کر زندگی کے مسائل کو نسبتہً محدود پیمانے پر سوچنے کا موقع ملا تو ان کی فکر نے آسانی سے ارتقا کے مراحل طے کئے۔

یونانی فلسفہ طلبِ علم کی آزادانہ خواہش سے شروع ہوا اور ابتداءً علم فی نفسہٖ مقصود کی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے وہ نظریاتی (IDEALISTIC) رنگ میں رنگا ہوا تھا۔[1] اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ دنیا کیسے بنی ہے اور کیسے چل رہی ہے۔ دورِ اوّل کے خالص یونانی فلسفہ (GREEK PHILOSOPHY) کے مقابلے میں دوسرا دور جس کو "ہیلینی رومی" فلسفہ (HELLENIC-ROMAN PHILOSOPHY) کا دور کہا جا سکتا ہے اس میں یہ سوال آ شامل ہوا تھا کہ مردِ دانا (WISE MAN) کو زندگی کیسے بسر کرنی چاہیے۔ گویا اب علم کے لیے غایت معین ہو گئی کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟[2] اس مرحلے میں معاشرہ کے تغیرات اس کا موضوع بن گئے اور تاریخی حوادث نظریات پر اثر انداز ہونے لگے۔ یہ چیز خالص یونانی فلسفہ میں نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں ہیلن ازم کے دور کا فلسفہ سماجی اور مذہبی مقاصد کے حصول میں انسان کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

---

[1] HISTORY OF ANCIENT PHILOSOPHY—BY W. WINDELBAND P. 4

[2] ایضاً۔ ص ۴

یونانی تمدن کے نشو و ارتقا میں قیادت ایونیوں (IONIANS) کے ہاتھ رہی جن کا رابطہ ایشیا سے تھا۔ یہ لوگ اس سلسلۂ جزائر کے باشندے تھے جو یونان کے مغربی اور جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہیں اور جن کا مجموعی رقبہ تقریباً ۱۱ سو مربع میل ہے[1]۔
ایونی جن کی معاش سمندر سے وابستہ تھی اور جو بحری تجارت کے علاوہ بحری قزاقی بھی کیا کرتے تھے، آزادی کی فضا میں پروان چڑھے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں یہ لوگ تین براعظموں کے درمیان بین الاقوامی تجارت کا ذریعہ تھے۔ اس دور میں میلیٹس[2] (MILETUS) یونان کی ذہنی زندگی کا مرکز بن گیا۔ یہاں ایک طرف دولت اور خوش حالی آ رہی تھی، دوسری طرف دنیا بھر سے اسباب تعیش و آرائش پہنچ رہے تھے اور تیسری طرف بین الاقوامی میل جول کی وجہ سے مختلف قسم کے فکری و ثقافتی اثرات بھی کام کر رہے تھے۔
ایونیوں پر اشرافی حکومت (ARISTOCRACY) مسلط تھی لیکن جب خوش حال شہریوں کا ایک مضبوط طبقہ پیدا ہو گیا تو اس نے اشرافی اقتدار کے خلاف مزاحمت شروع کر دی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں چھوٹی چھوٹی مقامی بادشاہتیں قائم ہو گئیں اور بادشاہوں کی درباری مجالس میں علم و ثقافت کے چرچے ہونے لگے۔ اشرافی طبقہ کے لوگ بھی جب سیاست سے کنارہ کش ہوئے تو علم و حکمت سے دلچسپی لینے لگے۔ اسی طرح علمی ترقی کی راہیں کھلیں[3]۔

یونانی ایسے ماحول میں دولت، آزادی اور دانائی سے آراستہ ہو کر دلچسپ سیاسی تجربے کرنے کے قابل ہوتے۔ ان میں ایتھنز کا تجربہ سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ یونان کے سیاسی تجربات کی اہمیت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے سیاسیات (POLITICS) نے ظہور کیا۔ پانچویں صدی ق م سے قبل بادشاہتیں اور رعیتیں تھیں، سیاسیات کا وجود نہ تھا۔

---

[1] EVERY MANS ENCYCLAPAEDIA — WORD: MILETUS.

[2] ایشیائے کوچک کا یہ شہر سیاسی لحاظ سے ایونی حلقۂ اقتدار میں تھا اور اہم وفاق شہروں میں سے انتہائی جنوبی شہر تھا۔ ملاحظہ ہو:

[3] HISTORY OF ANCIENT PHILOSOPHY — BY W. WINDELBAND: P: 16-17-18

رعمسیس، بخت نصر، کریسس، لائیڈین اور سائرس نے بڑی عظیم سلطنتوں پر فرماں روائی کی مگر ان کے مقبوضات میں سیاسیات نہ تھیں۔ کیونکہ سرے سے عوامی مسائل (PUBLIC AFFAIRS) کا وجود نہ تھا۔ مسائل تھے تو وہ فرماں روا اور بالائی طبقہ کے اپنے مسائل تھے۔ حکومت اور جو کچھ اس کے دائرۂ کار میں شامل تھا۔ فوجی ملازمت اور محصول بندی سے لے کر شاہی محل کے لیے عورتوں کی فراہمی تک۔ سارے معاملات فرماں روا کی مرضی اور طاقت کا اظہار تھے۔ بخلاف ان کے یونان میں جو عظیم قدم آگے اٹھا وہ اس امر کا تسلیم کیا جانا تھا کہ عوامی مسائل یا دوسرے لفظوں میں مشترک مفاد کے معاملات بھی کوئی چیز ہیں جو سب کے سامنے آنے چاہئیں۔ اولاً اس لیے کہ ان کا انتظام چلایا جاتے اور ثانیاً اس لیے کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔[1]

پس اہل یونان نے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے رکھی۔ کہ عوامی یا مشترک نوعیت کے مسائل موجود ہیں جنہیں مل جل کر حل کرنا ہے۔ ان مسائل کے بارے میں ان کا شعور یہ تھا کہ یہ انسانی مسائل ہیں۔ انسانوں کے پیدا کردہ ہیں اور انسانوں ہی کو ان کے حل کرنے کی سعی کرنی ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ مذہبیاً پُر اسرار قوتوں سے اصنام پر اعتقاد رکھنے اور ان کو قسمت گر ماننے کے باوجود سماجی و سیاسی معاملات میں "تن بہ تقدیر" نہیں ہوتے بلکہ ان معاملات کو چلانے میں انہوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا۔[2] پھر سیاسیات کے انسانی معاملات کو انہوں نے اپنی قدامت پسندی (CONSERVATISM) کے باوجود ہمیشہ عقل و تدبر سے حل کرنے کی کوشش

---

[1] THE LEGACY OF GREECE. CH: POLITICAL THOUGHT - BY A.E. ZIMMERN P:331-2

[2] LEGACY OF GREECE. CH: POLITICAL THOUGHT — BY A.E. ZIMMERN P: 332 - 333

کی۔ وہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کام لیتے تھے اور ان کی سیاسی بصیرت اپنے سامنے کی دنیا اور انسانی فطرت کے مطالعہ پر مبنی تھی[۱]۔ اس طرح یونانیوں میں سیاسی حکمت نے کونپلیں چھوڑیں۔ یہ حکمت جس کے ابتدائی ابواب آج کے دورِ خرد میں طفلانہ معلوم ہوتے ہیں اور جس کے تکمیلی کارناموں کو بھی انسانی فکر کا قافلہ پیچھے چھوڑ چکا ہے، جمہوری لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا ایک راز یہ ہے کہ اس کا نقشہ ہر یونانی کو استبداد سے نفور کرنے والا تھا۔ اس حکمت کے بانیوں میں ہزار اختلافات تھے مگر وہ ایک چیز پر متفق تھے کہ "استبداد (TYRANRY) حکومت کی بدترین شکل ہے، کیونکہ استبداد کے معنی غیر قانونی قوت کا استعمال ہے۔ خواہ وہ اپنے مقاصد اور نتائج کے لحاظ سے مفید ہی کیوں نہ پڑے۔ ایسی صورت میں بھی یہ اس لیے بُرا ہے کہ یہ حکومت خود اختیاری کے لیے تباہ کن ہے[۲]۔" کیا خوب کہا ایک دلدادۂ جمہوریت (EURIPIDES) شاعر نے:

"اس سے بدتر دشمن کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک ریاست پر مطلق العنان فرماں روا مسلط ہو جس کے دور میں قوانینِ عام کا وجود ہی نہ ہو۔ بلکہ وہ فرماں روا قانون کو اپنے ذاتی دستِ تصرف میں رکھ کر فرماں روائی کرے[۳]۔"

یہ تو تھی تمہیدی باتیں: آئندہ شمارے میں ہم انشاء اللہ یونانی حکمت کے ارتقا کی داستان عرض کریں گے۔

~~LEGACY OF GREECE: CH: POLITICAL THOUGHT~~

۱ P:335-337 BY- G. H. SABINE.

۲ A HISTORY OF POLITICAL THEORY—BY GEORGE H. SABINE P:29

۳ پوری نظم کے لیے دیکھیے:- THE SUPPLIANTS, II- 429-432

ماہنامہ چراغ راہ کراچی

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی نے کوئی وجہ بتائے بغیر ماہنامہ چراغ راہ کو نیا ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس صورت میں پرچے کے اجرا کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ اب ہم قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس میں ہمیں ناکامی ہوئی تو جن خریداروں کا چندہ ہمارے پاس جمع ہے ان کے بقایا کی ادائیگی کا انتظام کر دیا جائے گا۔ امید ہے کہ ناظرین چراغ راہ ہماری اس مجبوری کا لحاظ کریں گے۔

ناظم ادارہ

چراغ راہ کراچی

اعلان

ہم نے اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ۔ مکتبہ چراغ راہ کراچی۔ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور اور دیگر اسلامی لٹریچر خریداروں کے لیے فراہم کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ضرورت مند اصحاب ان کتب کے لیے ہمیں براہ راست ذیل کے پتہ پر آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

مینجر شعبۂ کتب ماہنامہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

مولانا مودودی کی چند اہم تصانیف

- **تفہیم القرآن** — وہ تفسیر جو اس دور کے انسان کے سامنے مقصدِ عمل کرتی ہے۔

جلد اوّل : سورۂ فاتحہ تا سورۂ انعام	۱۵٫۰۰ روپے
جلد دوم : سورۂ اعراف تا سورۂ بنی اسرائیل	۱۸٫۲۵ "
جلد سوم : سورۂ کہف تا سورۂ روم	زیر طبع

- **اسلامی ریاست** : انگریزی ایڈیشن ۱۲ روپے۔ اردو ایڈیشن "
- **قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں** : ۲٫۲۵ "
- **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی** : ۴٫۵۰ "
- **اسلام اور جدید معاشی نظریات** : ۲٫۲۵ "
- **سود** : مجلد ۵٫۰۰ غیر مجلد ۵ روپے سستا ایڈیشن ۳٫۲۵ "
- **پردہ** : ۴٫۰۰ "
- **حقوق الزوجین** : ۲٫۵۰ "
- **اسلام اور ضبطِ ولادت** : ۱٫۰۰ "
- **اسلام کا نظام حیات** : ۵۰ پیسے
- **خطبات** : ۴٫۲۵ روپے
- **دینیات** : ۲٫۵۰ روپے
- **تفہیمات** (جلد اوّل) : ۵٫۰۰ "
- (جلد دوم) : ۴٫۰۰ "
- **تنقیحات** : ۴٫۵۰ "
- **رسائل و مسائل** (جلد اوّل) : ۵٫۵۰ "
- (جلد دوم) : ۶٫۰۰ "

> اس دور کے انسان کے ہر مسائل کی تنقیح و تفہیم
> ---
> اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے حل و تجربات۔
> ★

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور